سہ ماہی کاروانِ ادب لکھنؤ

مرکزی دفتر رابطہ ادب اسلامی (عالمی)
شعبۂ برصغیر، لکھنؤ (انڈیا)

سہ ماہی

کاروان ادب

شمارہ نمبر-۳	اکتوبر، نومبر، دسمبر ۲۰۲۰ء	جلد نمبر-۲۷

مجلس مشاورت

• مولانا سعید الرحمٰن اعظمی ندوی • مولانا حافظ فضل الرحیم • ڈاکٹر محمود الحسن عارف • مولانا محمد سلطان ذوق ندوی

مشرف عام

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صدر رابطہ ادب اسلامی شعبۂ برصغیر

مدیر تحریر

ڈاکٹر محسن عثمانی ندوی

نائب مدیر

مولانا جعفر مسعود حسنی ندوی

معاون تحریر : مولانا نذر الحفیظ ندوی

مجلس ادارت

• ڈاکٹر شفیق احمد ندوی، دہلی • ڈاکٹر تابش مہدی، دہلی • مولانا محمد الیاس بھٹکلی ندوی، بھٹکل

معاون انتظامی اقبال احمد ندوی

-: زرتعاون :-

اس شمارہ کی قیمت: ۵۰ روپے، سالانہ برائے ہندوستان ۲۰۰ روپے پاکستان و بنگلہ دیش: ۳۰۰ روپے یا ۱۰ امریکی ڈالر ان کے علاوہ دیگر ممالک: ۴۰۰ روپے

چیک یا ڈرافٹ اس نام سے بنائیں

RABITA-AL-ADAB-AL-ISLAMI(INDIA)

-: صدر دفتر :- رابطہ ادب اسلامی (عالمی) پوسٹ بکس ۹۳، ندوۃ العلماء، لکھنؤ

Designed & Printed at : Mashhud Enterprises Lko. Mob. 9839133588, 9451947786

اس شمارے میں

ابتدائیہ: زبان انسان کے لیے بڑی نعمت	حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی	۳
اداریہ: مخطوطات۔ ترس رہے ہیں کسی مردِ کارداں کے لیے	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۵
حمد	سید ریاض حسین زیدی	۸
نعت شریف	عاصی کرنالی	۹
مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندویؒ کی زندگی کے تشکیلی عناصر	ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی	۱۰
عربی کے مشہور ادیب احمد امین کی خودنوشت سوانح ''حیاتی''	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۱۹
علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نظموں میں ملت کی دردمندی کا تذکرہ	اقبال احمد ندوی	۲۳
ادبِ اطفال میں قصوں اور کہانیوں کی اہمیت اور حکیم شرافت حسینؒ کی کاوشیں	سید ضیاء الحسن	۳۲
بچوں کے لیے حکیم شرافت حسین رحیم آبادیؒ کی پیاری کتاب ''حضرت عمرؓ''	ڈاکٹر غیاث الدین ندوی	۴۰
ایک دلنواز شخصیت......ایک باوقار فنکار ظہیر الدین ظہیرؔ رانی بنوری	عزیز بلگامی	۴۶
دکن میں اردو کا آغاز وارتقا	محمد شاداب خان	۵۱
اردو زبان وادب کے ارتقا میں دکن کا حصہ	محمد مسعود عزیزی ندوی	۵۸
تعارفِ کتاب......فضیل ناصری کا مجموعہ کلام ''آؤ کہ لہو رولیں''	پروفیسر محسن عثمانی ندوی	۶۷
شمشیر گمشدہ......اقبال کی نایاب تاریخی نظم	ڈاکٹر رؤف خیر	۷۴
افسانہ : تحریک	جیلانی بی اے	۷۵
غزل	قدیرؔ شیدائی	۸۰

ابتدائیہ

زبان انسان کے لیے بڑی نعمت

حضرت مولانا سید محمد رابع حسنی ندوی

صدر رابطہ ادب اسلامی

انسان کو اس کے ربِّ کریم نے زبان جیسی نعمت ایسی عطا فرمائی کہ انسان کو اشرف المخلوقات اور منتظمِ احوال بنادیا۔ اس کی ضرورت کے لیے بات ادا کرنا سکھایا۔ اللہ تعالیٰ اپنے اس احسان کو بیان کرتے ہوئے فرماتا ہے: ﴿خلق الإنسان ، علّمه البيان﴾ انسان کو پیدا بھی کیا اور اس کو بیان کرنا بھی سکھایا۔ زبان کی اسی خوبی اور اہمیت کو بیان کرتے ہوئے ایک جاہلی شاعر زہیر بن ابی سلمی اپنے معلقہ میں کہتا ہے:

وكائن ترى من صامت لك معجب
زيادته أو نقصه في التكلم
لسان الفتى نصف و نصف فؤاده
فلم يبق إلا صورة اللحم و الدم

(ترجمہ): کتنے خاموش اور کم گو انسان ایسے ہیں کہ ظاہر میں بڑے خوب صورت دکھتے ہیں، ان کا سراپا من کو بھاتا ہے، لیکن ان کی اصل حقیت اُس وقت سامنے آتی ہے اور ان کے عیب و ہنر کا پتہ اُس وقت چلتا ہے جب وہ بولنے کے لیے زبان کھولتے ہیں۔ کسی بھی جواں مرد کا وجود بس دو چیزوں پر منحصر ہوتا ہے: اس کا نصف وجود مرکزِ گویائی اس کی زبان ہوتی ہے اور نصفِ آخر اس کا مرکزِ غور و فکر قلب و دماغ ہوتا ہے۔ اگر کسی انسان میں یہ دو چیزیں (اعلیٰ معیار کی) نہ ہوں تو گویا اس کا وجود محض گوشت اور خون پر مشتمل ایک ڈھانچہ ہے، اس کے سوا اور کچھ نہیں)۔

زبان انسان کے لیے غیر معمولی ترقیات و انتظامات کو اعلیٰ طریقے سے انجام دینے کی صلاحیت کا ذریعہ بنی۔ انسان اس کے ذریعے دوسروں کے اور اپنے تجربات اور قابلِ اختیار حالات سے واقف ہوتا ہے۔ پھر زبان ہی کے سانچے کے ذریعے دور رہنے والے شخص تک اس کو پہنچاتا ہے اور مرورِ زمانہ پر بھی اس کے بہت پہلے کے حالات سے واقف ہونے اور استفادہ کرنے کے لائق ہوتا ہے۔ چنانچہ زبان کے ذریعے گذشتہ صدیوں سے پہلے کے واقعات اور حالات سے موجودہ انسان کی طرح واقف ہوجاتا اور ان کو آگے بڑھانے اور مزید نئے

تجربات حاصل کرنے کا فائدہ اٹھاتا ہے ۔ زبان کی یہ افادیت انسان کی ظاہری زندگی کے حالات اور تجربات کے دائرے میں بھی کام دیتی ہے اور انسان کے اندرون اور قلب و دماغ کے احساسات وتصورات کی ترجمانی میں بھی کام دیتی ہے، اور اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے انسان کی فطرت میں استطاعت بھی رکھی ہے جس کی بنیاد پیدائش کے بعد سے ہی شروع ہوجاتی ہے حتی کہ ایک تین سالہ، چار سالہ بچہ بھی اپنی بات اور احساس کو بعض وقت بالکل بڑوں کی طرح ظاہر کردیتا ہے۔ اس کو دیکھو اور اس کی حسنِ ادائی دیکھو تو تعجب ہوتا ہے۔

زبان کی اسی کارگزاری کے ذریعے انسانوں کے مابین احساسات وتخیلات میں جو فرق ہوتا ہے ان کی ترجمانی بھی الگ الگ ہوتی ہے اور ان کے درمیان جو فرق ہوتا ہے اس سے ان کے مابین زندگی کا انداز بھی متاثر ہوتا ہے جس کو ہم تہذیب سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ انسان جو دیکھتا یا سنتا ہے یا اپنے ہم مزاج باشندگانِ وطن کو کرتے دیکھتا ہے اور وہ اسے پسند آتا ہے تو اس کو ویسا ہی بنالیتا ہے اور وہ اس کی تہذیب بن جاتی ہے۔ اس طرح زبان کے اثر سے تہذیبوں کی تشکیل اور جذبات وتخیلات کی کیفیت اسی کے مطابق ہوجاتی ہے۔ لہذا تہذیبوں، مذہبوں اور نظریاتِ حیات کے معاملات کی فکر کرنے والے ان مقاصد کے لیے زبان کو خاص طور پر اختیار کرتے ہیں جو تقریروں، گفتگوؤں ، حکایات اور قوتِ عبارت کے ذریعے ہوتا ہے اور اس کے نتیجے میں بعض وقت مذہب، بعض وقت ادب وتہذیب اور بعض وقت طرزِ حیات میں تبدیلی لے آئی جاتی ہے ۔ زبان کی اثر انگیزی کی قسم ادب کہلاتی ہے اور اس کی دل نشینی زبان کی اس قسم کو بہت کارگزار بنادیتی ہے۔ اس طرح کی اثر انگیزی کو جو اہلِ فکر وعمل ہوتے ہیں صنفِ زبان کو برقرار رکھنے یا اس کو بدلنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہمارے برصغیر ہندوستان میں دیکھا جائے تو اس کی واضح مثال ملتی ہے ۔ شمالی ہندوستان کے علاقے کی اردو اور پاکستان کی اردو میں فرق ملے گا۔ ہندوستان کی اردو کے ہندی سے امتزاج کی بنا پر دونوں میں ایک مشترک رنگ ہے جس کو کوئی ہندی کہتا ہے، کوئی اردو کہتا ہے، حالانکہ یہ دونوں سے الگ ہوکر نئے نام سے تعبیر کیے جانے کے زیادہ لائق ہے۔ البتہ رسم الخط کا مسئلہ اس سلسلے میں بہت اہم ہوگیا ہے ۔ یہ رسم الخط اپنے الگ الگ اثرات رکھتا ہے ، چنانچہ شمالی ہند کی زبان پر اس کا اثر پڑرہا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

اداریہ

مخطوطات......ترس رہے ہیں کسی مردِ کارداں کے لیے

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

اسلام میں علم اور مطالعہ اور تحقیق کی اور متاعِ لوح وقلم کی بڑی اہمیت ہے۔علم کو عبادت کا درجہ دیا گیا ہے۔ایک حدیث ہے جس میں کہا گیا ہے کہ علم میں زیادتی عبادت میں زیادتی سے بہتر ہے۔علم کا ایک شعبہ مخطوطات کی تحقیق بھی ہے۔امام اوزاعی نے لکھا ہے کہ کثرتِ تصنیف اس امت کا اعجاز ہے۔ یہ تصنیفات مخطوطات کی شکل میں آج بھی موجود ہیں۔محققین نے بے شمار مخطوطات کی تحقیق وتدوین کی ہے اور ان کو زیورِ طبع سے آراستہ کیا ہے اور بے شمار مخطوطات ابھی کتاب خانوں میں بند ہیں اور کسی دستِ تحقیق وتدقیق کے منتظر ہیں۔تحقیق کے میدان میں مستشرقین کی کاوش کا بھی اعتراف کرنا چاہئے اور سچ یہ ہے کہ یہ جدید فن ان ہی کے ذریعے سے مسلمان محققین تک پہنچا اور عام ہوا۔مشہور محقق صلاح الدین المنجد مغرب کے معیار اور اصولِ تحقیق کو درست قرار دیتے ہیں۔اس کے مقابلے میں عبد السلام ہارون نے مشرقی اور قدیم بعض اصولِ تحقیق کی وکالت کی ہے۔مستشرقین نے ابتدا میں اپنے مقاصد کے تحت عربی زبان سیکھی ،عربی کتابیں پڑھیں اور ان کی تحقیق کی اور ان کو تنقید کا نشانہ بنایا اور ان میں شکوک پیدا کرنے کی کوشش کی۔مقصد یہ تھا کہ اسلام کے سیلِ رواں کو روکا جائے ۔ بعد میں بعض مستشرقین کے یہاں معروضیت بھی پیدا ہوئی۔پریس کی ایجاد کے بعد مخطوطات کو تحقیق وتدوین کے بعد شائع کیا جانے لگا۔اس طرح سے علمِ سینہ علمِ سفینہ بن گیا اور ہر خاص وعام تک ان کتابوں کی رسائی ہوگئی۔حاجی خلیفہ کی ''کشف الظنون''،ابن الندیم کی ''الفہرست''، زمخشری کی ''المفصل''، علامہ ذہبی کی ''تذکرۃ الحفاظ''، ابن ہشام کی ''السیرۃ النبویۃ''، ابن خلکان کی ''وفیات الاعیان''، یاقوت الحموی کی ''معجم البلدان'' وغیرہ کی ایڈیٹنگ سب مستشرقین کے کارنامے ہیں۔کارل بروکلمان کی تاریخ ادبِ عربی میں دنیا میں پھیلے ہوئے مخطوطات کا ذکر تفصیل سے ملتا ہے۔فواد سزگین کی تاریخ التراث العربی میں بھی مخطوطات اور مراجع کا ذکر شرح وبسط سے کیا گیا ہے۔

عرب ملکوں میں جب طباعت کا دور شروع ہوا اور چھاپہ خانے قائم ہونے شروع ہوئے تو تحقیق اور تدوین کا دور بھی شروع ہوا اور عرب علما بھی مخطوطات کی تدوین کا کام کرنے لگے ۔رفاعہ طہطاوی کے ساتھ تحقیق اور تدوین کا کام کرنے والوں کی ایک جماعت تیار ہوگئی۔دار الکتب المصریہ نے بھی مخطوطات کی فہرست شائع کی۔مختلف کتاب خانوں نے اپنے اپنے مخطوطات کی مبسوط فہرستیں شائع کیں۔ اس طرح تحقیق اور مخطوطہ شناسی کا فن پروان چڑھنے لگا۔ مخطوطہ شناسی اور تحقیق کے لیے زبان وادب میں مہارت اور موضوع سے پوری مناسبت اور مخطوطہ کے مختلف نسخوں کا علم

اور تقابلی مطالعہ لازمی شرط ہے۔

ہندوستان کی بھی عربی فارسی مخطوطات کی پورے عالمِ اسلام میں شہرت ہے۔کہا جاسکتا ہے کہ ''دفن ہوگا نہ کہیں ایسا خزانہ ہرگز''۔ یہ مخطوطات جب تک محقق ہو کر منظر عام پر نہ آ جائیں،ان کی حیثیت ایک طرح سے دفینہ ہی کی ہے۔ان دفینوں اور نگینوں کو تحقیق کر کے وقفِ خاص و عام کر دینے کی ضرورت ہے۔اس لیے مخطوطات کی تدوین کی ٹریننگ دینے اور اس علمی اور تحقیقی ذوق کو عام کرنے اور محققین کی قدر افزائی کی بہت زیادہ ضرورت ہے۔افسوس ہے کہ یہ کام ہمارے علمی اداروں میں ابھی تک ناقدری کا شکار ہے۔جب عالمِ اسلام پر تاتاریوں کی یورش ہوئی تھی اور بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی،اُس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی مستحکم حکومت قائم تھی۔بے شمار علما اور مصنفین اپنی علمی کتابوں اور مخطوطات کو اور علمی جواہر پاروں کو سینوں سے لگائے ہوئے ہندوستان پہونچے تھے۔یہی وجہ ہے کہ آج ہندوستان کے کتاب خانے مخطوطات کی بے بہا ثروت سے نہال اور مالا مال ہیں۔حیدراباد،عظیم آباد،رام پور،علی گڑھ،ٹونک،کلکتہ اور دوسرے شہروں کے کتاب خانوں میں مخطوطات کے ذخائر ہیں جو کسی محقق کے دستِ ہنرمند اور مردِ خردمند کے منتظر ہیں اور زبانِ حال سے کہہ رہے ہیں کہ ''مردے از غیب بروں آید و کارے بکند''۔لیکن ہندستان کے بعض کتاب خانوں میں مخطوطات کے سرقے اور ان کی اسمگلنگ کے جو واقعات پیش آئے ہیں، ان کی وجہ سے مخطوطات کی نقل حاصل کرنے کے قوانین سخت ہو گیے ہیں اور مخطوطات کی پوری نقل حاصل کرنا جوئے شیر لانے کے مرادف ہوگیا ہے۔

تحقیق دراصل متن کو تصویب وتصحیح کے بعد منظرِ عام پر لانے کا نام ہے۔اس کام میں متن کے مختلف نسخوں کا تقابلی مطالعہ کرنا پڑتا ہے۔متن کو تحریف اور تصحیف سے پاک کرنا پڑتا ہے۔مختلف رسمِ خط پڑھنے میں مہارت حاصل کرنی پڑتی ہے، کیونکہ تمام مخطوطے ایک ہی رسمِ خط میں نہیں ہوتے ہیں۔اور پھر ہر عہد کا رسمِ خط الگ ہوتا ہے۔اسی طرح ایک محقق کو حواشی تحریر کرنے پڑتے ہیں۔حواشی میں متن کے الفاظ کی وضاحت کرنی پڑتی ہے۔مختلف نسخوں کے درمیان اگر فرق ہو تو وہ بھی بیان کرنا پڑتا ہے۔اگر محقق جس مخطوطہ پر کام کر رہا ہے،اس کا کوئی حصہ ناقص ہو تو دوسرے نسخوں کو سامنے رکھ کر اس کی تکمیل کرنی پڑتی ہے۔اس کا ذکر اسے حاشیے میں کرنا پڑتا ہے۔املا کو درست کرنا ہوتا ہے۔رموزِ اوقاف کا لحاظ کرنا پڑتا ہے۔مقدمہ میں مخطوطہ کی اہمیت اجاگر کرنی پڑتی ہے۔اگر قرآن کی آیتیں اور حدیثیں یا اشعار یا اقوال مخطوطہ میں ہوں تو اس کے لیے مصادر اور مراجع کی طرف رجوع ہونا پڑتا ہے۔اماکن واشخاص کا تذکرہ اگر ہے تو ان کا تعارف بھی لکھنا ہوتا ہے۔تعیینِ زمانہ کے لیے تاریخ وسیر کی کتابوں کو کھنگالا جاتا ہے۔مشکل اور مغلق الفاظ اور اصطلاحات کی حاشیہ میں تشریح بھی ایڈٹ کرنے والے کی ذمہ داریوں میں شامل ہے۔اور اگر کسی ناشر کے پاس کسی معاصر مصنف کا کوئی نیا مخطوطہ آتا ہے جسے شائع کرنا ہے تو پیراگراف کو گھٹانا بڑھانا،زبان وبیان کو بہتر بنانا،تکرار کے عیب کو دور کرنا یہ سب محقق کی ذمہ داری ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تحقیق وتدوین کا کام کس قدر مشکل اور کس قدر نازک ہے اور اس کے لیے کس قدر علمی صلاحیت درکار ہے۔یہ کام بہت محنت اور دیدہ ریزی کا طالب

ہے۔ بہت باریک بینی اور دقتِ نظری کا طلبگار ہے۔اس کام میں تمام ذہنی توانائیوں کو بروئے کار لانا ہوتا ہے۔ یہ چونٹیوں کی طرح شکر کے دانے جمع کرنے کا کام ہے۔ یہ بادِ صبا کی طرح گل کترنا ہے۔شبنم کی طرح پھولوں کو نہلانا ہے۔ یہ عروسِ نو کو آراستہ کرنا ہے اور اس کی حنا بندی کرنا ہے۔ یہ ایک پوشیدہ گنجِ گرانمایہ کو علما اور اربابِ ذوق تک پہونچانا ہے۔

مخطوطہ کسی زبان کا ہو، وہ جتنا زیادہ قدیم ہوگا، اس کی اہمیت اتنی ہی زیادہ ہوگی۔ ہندوستان میں جو لوگ تحقیق اور تدوین میں مشہور ہوئے، ان میں امتیاز علی خان عرشی، حافظ محمود خان شیرانی، قاضی عبد الودود، ڈاکٹر حمید اللہ، پروفیسر عبدالمعید خان، مولانا ابو الوفاء افغانی، مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی، عبد العزیز میمن، پروفیسر مختار الدین آرزو، محی الدین قادری زور کا نام آتا ہے۔عربی مخطوطات کی تحقیق کے لیے عربی زبان اور قواعد سے واقفیت اور جدید دور کے تحقیقی اور علمی طریقوں سے واقفیت ضروری ہے۔

مخطوطات کی ابتدا اس طرح ہوئی کہ پہلے پتلی کھال پر کتابت ہوتی تھی۔ ہارون رشید (متوفی ۱۹۳ھ) کے زمانے تک کھال پر قرآنِ مجید کے نسخے لکھے جاتے تھے۔کھال کی دباغت کی جاتی تھی۔کھال کے ساتھ درختوں کی چھال کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ پیشہ ور کاتبوں کا طبقہ وجود میں آیا جن کو نساخین یا وراقین کہا جاتا تھا۔اس طرح خوش نویسی کے فن نے بھی ترقی کی۔کتابیں جب کثرت سے لکھی جانے لگیں تو پھر کتاب خانے وجود میں آئے جہاں ہاتھ سے لکھی ہوئی کتابیں رکھی جاتی تھیں۔مخطوطات اسی دور کی یادگار ہیں۔اندلس کے بعض کتاب خانوں کے بارے میں آتا ہے کہ ان میں ایک لاکھ سے زیادہ سے کتابیں تھیں۔

بغداد کا دار الحکمت، مصر کا دار العلم، اندلس کا مکتبہ قرطبہ، مکتبہ دمشق، مکتبہ نظامیہ کا نام قدیم عہد کے مشہور کتاب خانوں میں ہوتا ہے۔ترکی میں غالباً سب سے زیادہ مخطوطات ہیں۔ڈاکٹر حمید اللہ نے ترکی کو مخطوطات کا دار الخلافہ قرار دیا تھا۔ پہلے اعلی علمی ذوق کے لوگ اچھی اور پسند کی کتابوں کو نساخین سے نقل کرواتے تھے۔ایک ایک کتاب کی کئی کئی نقلیں تیار کی جاتی تھیں اور مختلف کتاب خانوں میں ان کو محفوظ کیا جاتا تھا۔صحتِ متن کا خاص خیال رکھا جاتا تھا۔آج بہت سے مخطوطات کے مختلف نسخے مختلف کتاب خانوں میں اسی لیے پائے جاتے ہیں۔یہ مخطوطات ہماری میراثِ گم گشتہ ہیں۔

آج چونکہ مخطوطات شناسی اور تحقیق کا کام ناقدری کا شکار ہے، اس لیے اہلِ علم و ہنر نے اس کام سے صرفِ نظر کر لیا ہے اور یہ کہنے لگے ہیں کہ ”اس نے نظر جو پھیر لی ہم نے بھی جام رکھ دیا“ اور جو محققین گوشۂ تنہائی میں بیٹھ کر ابھی تک ستائش کی تمنا اور صلہ کی پروا کیے بغیر بایں ہمہ ناقدری اور ناسپاسی اس کام میں لگے ہوئے ہیں، وہ دراصل علم اور تحقیق کی خاطر بڑی قربانی دے رہے ہیں اور معیارِ زندگی کی بلندی کی اس ریس میں اور بادِ صرصر میں علم کا چراغ اٹھائے ہوئے ہیں۔کیونکہ اسی سے شجرِ علم سایہ دار اور روشِ بہار ہوتا ہے اور دانہ خاک میں مل کر گل و گلزار ہوتا ہے۔ان سے کوئی ان کا حال پوچھتا ہے تو جواب میں یہ کہتے ہیں۔

اچھی گذر رہی ہے دلِ خود کفیل سے
لنگر سے روٹی ملتی ہے پانی سبیل سے

☆☆☆☆☆

حمد

سید ریاض حسین زیدی

لاتعداد اور بے حد شکلوں میں وہ یکتا دیکھا ہے
اس کا ہے ہر روپ سہانا، اس کو اُجلا دیکھا ہے

اپنا آپ چھپائیں لاکھوں کنج کوئی ہو اس کا ہے
مضمر اک اک نکتہ سارا اس پر کھلتا دیکھا ہے

ڈوبتی نبضوں کا لوٹانا اس کا ہے اک خاص کرم
ڈولتے قدموں کا بھی اس سے ٹھیک سنبھلنا دیکھا ہے

آنکھیں کچھ سمتوں کو دیکھیں، اس کی ساری سمتیں ہیں
جگ جگ اس کی شانیں دیکھیں رتبہ اعلیٰ دیکھا ہے

چشم زدن میں وہ چاہے تو چڑھتی دھوپ کو سایہ دے
بپھرے دریا کا بھی اس سے خوب اترنا دیکھا ہے

قوسِ قزح میں اس کی رنگت چلتے بادل اس کے ہیں
ہر صورت ہر کام میں اس کا سکّہ چلتا دیکھا ہے

نس نس میں وہ شعلہ فشاں ہے، آنکھ میں رونق اس سے ہے
مہردرخشاں نورِ الٰہی دل میں بنتا دیکھا ہے

ہم چاہیں تو دکھ سکھ اپنا بے کھٹکے اس سے کہہ لیں
شہ رگ سے وہ اتنا قریں ہے اس کا سننا دیکھا ہے

نعت شریف

عاصیؔ کرنالی

لب صادق سے ان کے جو سخن تقریر ہوجائے
کبھی قرآن بن جائے، کبھی تفسیر ہوجائے

وہ چاہیں اور سرِ ارض و سما جھک جائے قدموں پر
وہ دیکھیں اور دلِ کون و مکاں تسخیر ہوجائے

تمنا ہے کسی شب خواب میں ان کی زیارت ہو
تمنا ہے کسی شب خواب ہی تعبیر ہوجائے

قدم جب بھی مرے اٹھیں، مدینے کی طرف اٹھیں
یہی اک راستہ میرا خطِ تقدیر ہوجائے

میں تیرے گنبد خضرا سے جب لوٹوں تو یوں لوٹوں
یہ بیت النور میرے قلب پر تعمیر ہوجائے

میں جب دیکھوں جدھر دیکھوں جہاں دیکھوں تجھے دیکھوں
تو میری آنکھ کی پتلی پہ یوں تحریر ہوجائے

مدینے سے ہمارا قافلہ چلنے کا وقت آیا
الٰہی! قافلہ چلنے میں کچھ تاخیر ہوجائے

جسے میں مدحِ آنحضرت کے لائق کہہ سکوں عاصیؔ
اک ایسی نعت ساری عمر میں تحریر ہوجائے

مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے تشکیلی عناصر

ڈاکٹر سعید الرحمٰن فیضی ندوی
چیئرمین ندوہ اسلامک ریسرچ سنٹر، کناڈا

ممتاز عالم دین حضرت مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ بیسویں صدی کے ان نابغۂ روزگار مفکروں اورداعیوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں جنھوں نے قافلۂ انسانیت کو بے راہ روی سے نکال کر صحیح رخ پر ڈالا اوران کو ان کے مقام اور پیام سے روشناس کرایا، اس کے لیے جہاں انھوں نے اپنے افکارونظریات کے ذریعہ ان میں زندگی کی روح پھونکی، وہیں عملی اقدامات کے ذریعہ سے راہیں بھی روشن کیں، کیوں کہ بیسویں صدی کے نصف آخر میں پوری انسانیت ایک تذبذب اور گومگو کی کیفیت سے دوچار تھی، ترقی کے میدان میں لوگ اگر ایک قدم آگے بڑھاتے تھے تو فوراً دوسرا قدم پیچھے ہٹا لیتے تھے، افراط وتفریط نے ان کا سکون غارت کر دیا تھا، کوئی ایک فرد بھی ایسا نظر نہیں آتا تھا جو وسطیت واعتدال کا نمونہ ہو، تردد وکشمکش اور بے اعتدالی کے اس ماحول میں اللہ عزوجل نے مولانا سید ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کو برپا کیا، تاکہ انسانیت کی کشتی کو جو بھنور میں ہچکولے کھارہی تھی، ساحلِ مراد تک پہنچانے میں اپنا کردار ادا کریں، اور تاریخ شاہد ہے کہ مولانا مرحوم نے فکری، عملی اور ثقافتی میدان میں اعتدال ومیانہ روی کے ایسے نقوش چھوڑے کہ کوئی فردِ بشر ان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

سوال پیدا ہوتا ہے کہ مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کی شخصیت کے وہ عناصرِ ترکیبی کیا ہیں، جنھوں نے ان کو بیسویں صدی کے رستاخیز دور میں ایک مفکر ومصلح کی حیثیت سے لاکھڑا کیا؟ وہ عناصر درج ذیل ہیں:

پہلا عنصر:

مولانا کا علمی خانوادہ اوراس کا انتہائی پاکیزہ اور تربیتی ماحول ہے۔

اس خانوادے میں دین وایمان کی حفاظت، اللہ کی رسی سے مضبوط وابستگی اور ہر دور میں ایسے نامور علماء وفضلاء کی موجودگی ہے جو اپنے اپنے دور میں بڑے واجب الاحترام تھے، جن کی بات سنی اور مانی جاتی تھی، چنانچہ اسی علمی خانوادے میں مجاہدِ اسلام سید احمد شہید رحمۃ اللہ علیہ کی نمود ہوئی، جنھوں نے ۱۹ویں صدی میں پورے برصغیر کے تنِ مردہ میں جہاد کی روح پھونک دی، اسی خاندانِ نبوت کے چشم وچراغ مولانا علی میاں رحمۃ اللہ علیہ کے والدِ گرامی قدر علامہ عبدالحی حسنی رحمہ اللہ اوران کے قابلِ فخر والد جناب فخرالدین خیالؔی صاحب ہیں، جو فارسی کے بڑے ادیب اور بڑے خداترس انسان تھے،

اوراسی سلسلے کی ایک اہم ترین شخصیت مولانا علی میاں ندویؒ صاحب کے بڑے بھائی مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی ندوی رحمہ اللہ کی ہے جن کی ذات میں مشرق ومغرب اپنی تمام تر جلوہ سامانیوں اور خوبیوں کے ساتھ سمٹ آیا تھا۔

دوسرا عنصر:

مولانا کی زندگی کی تشکیل وتعمیر ہے۔

مولانا کی زندگی کی تشکیل وتعمیر میں دارالعلوم ندوۃ العلماء کا کردار بہت ہی اہم اور نمایاں ہے،اوراسی کودوسرے تشکیلی عنصر کی حیثیت سے بیان کیا جاتا ہے، ندوۃ العلماء کی تاسیس پربیس برس کا عرصہ گزرچکا تھا،اورملک بھرمیں وقتاً فوقتاً منعقد ہونے والے اس کے سالانہ جلسوں کی وجہ سے ندوۃ العلماء کا شہرہ دوردورتک پہنچ چکا تھا،اوراس عظیم اسلامی تحریک اورقدیمِ صالح اور جدید نافع کے جامع اس ادارے سے مولانا کے والدِ محترم اور برادرِ بزرگ مولانا ڈاکٹر عبدالعلی حسنی ندویؒ کا بڑا گہرا اور انتظامی تعلق تھا،جس کے نتیجے میں خود مولانا کی ذات کوبھی اس سے فیضیاب ہونے کا موقع ملتا رہا، بلکہ اسی کے آغوش میں پلے بڑھے،قدیم وجدید کے سنگم اس ادارے میں طالبِ علمی کی برکت سے مولانا کو معاصر تحریکوں، باطل نظریات اورجدید تخریبی رجحانات سے اچھی طرح واقف ہونے اوران کے حل تلاش کرنے کا بھی موقع ملا۔

تیسرا عنصر:

علامہ اقبال کی انقلابی وعقابی شاعری ہے۔

تیسری چیز جس نے مولانا کی شخصیت سازی میں انقلابی کردارادا کیا، وہ علامہ اقبال رحمہ اللہ کی انقلابی اورعقابی شاعری ہے،علامہ ندویؒ، شاعرِ مشرق علامہ اقبال رحمہ اللہ کو بہت محبوب رکھتے تھے، یہاں تک کہ مولانا نے ان کے اشعار کو عربی قالب میں عربوں کے سامنے پیش کیا۔عربوں کے سامنے ان کے فکر وفن کی ترجمانی کی،''روائع اقبال'' جیسی کتاب تصنیف فرما کر عربوں کے سامنے ان کا بھر پور تعارف کرایا،اورلاہور جاکر مولانا نے ان سے ملاقات بھی کی،مولانا علامہ کے اشعار جھوم جھوم کر کثرت سے پڑھا کرتے تھے، علامہ اقبال وہ شاعر ہیں جنہوں نے مغربی افکار ونظریات اور طرزِ معاشرت پرزبردست تنقید کی ہے،اوران کے گھروں میں گھس کران پر حملہ کیا ہے،علامہ اقبال خود بھی کہا کرتے تھے، چونکہ میں نے خاکِ مدینہ کواپنی آنکھ کا سرمہ بنارکھا ہے،اس لیے مغربی تہذیب کی چمک دمک میری آنکھوں کوخیرہ نہ کرسکی۔

چوتھا عنصر:

قرآنِ کریم اور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ہے۔

قرآنِ پاک محمد رسول اللہ (ﷺ) پر نازل کی ہوئی وہ کتاب ہے، جو ہرمسلمان کے لیے کتابِ ہدایت ہے، چنانچہ مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی اپنے فکروفن کی بنیاداسی پر رکھی اوراس کی تعمیر میں بھی اسی سے استفادہ کرتے رہے، اوراسی طرح مولانا علی میاں ندوی رحمہ اللہ نے سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کوبھی ہمیشہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھا، کیوں کہ یہ دونوں اسلام کے ایسے سرچشمے ہیں جن سے اگر سیرابی حاصل نہ کی گئی، توانسان ہمیشہ ضلالت وگمراہی کے صحراء میں بھٹکتا رہے گا۔ رسولِ پاک (ﷺ) کا ارشاد ہے:''میں نے تمہارے لیے دو چیزیں چھوڑ دی ہیں، جب تک تم ان دونوں کومضبوطی سے تھامے رہوگے، ہرگز گمراہ نہیں

ہو گے،ایک تو اللہ کی کتاب ہے اور دوسری رسول اللہ (ﷺ) کی سنت‘‘۔(الموطا للامام مالکؒ)

پانچواں عنصر:

تاریخ اور علومِ اسلامیہ ہے۔

تاریخ اور اسلامی علوم کا مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے بڑی باریک بینی اور دقیقہ رسی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے،اسی طرح ادیان ومذاہب کا بھی تحقیقی اور تجزیاتی مطالعہ کیا، جس کے نتیجہ میں قوموں کے عروج وزوال کے تمام گوشے آپ کی نگاہوں کے سامنے روشن ہوگیے، چنانچہ جب کبھی آپ کا خطاب ہوتا، یا محاضرہ دیتے، یا کہیں علمی مجلسوں میں گفتگو ہوتی،تو وہ بہت مدلل اور سلجھی ہوئی ہوتی،لوگ آپ کے آراء و افکار سے مطمئن ہوجاتے اور آپ کے ارشادات وفرمودات پر عمل شروع کردیتے۔

چھٹا عنصر:

خدا ترس علماء کے ساتھ اصلاحی تعلق اور وابستگی ہے۔

مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے وقت کے علماء ومشائخ سے اصلاحی تعلق رکھتے تھے اور وقتاً فوقتاً ان کی خدمت میں حاضری دیتے اوران سے استفادہ کرتے تھے،اس چیز نے بھی مولانا کی شخصیت سازی میں اہم کردار ادا کیا اورآپ خود بھی ’’عالمِ ربانی‘‘ تھے، علامہ یوسف القرضاوی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو’’العالم الربانی‘‘ لکھا ہے،مولانا دل کی گہرائیوں سے اس بات کا یقین رکھتے تھے کہ دینِ اسلام کی اشاعت ’’رجال اللہ‘‘ یعنی اللہ کے مخلص بندوں اور ’’کتاب اللہ‘‘ کے ذریعہ ہی ہوئی ہے، لہٰذا مولانا نے اس اہم گوشے کی طرف بھی بڑی توجہ کی اوراہل اللہ سے وابستہ رہے، اوران کی خدمت میں حاضری کو باعثِ سعادت وبرکت سمجھتے رہے، وہ مشائخِ عظام جن کی خدمت میں باریابی کو مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ باعثِ خیروبرکت شمار کرتے تھے،حسب ذیل ہیں:

(۱) مولانا شیخ عبدالقادر رائے پوری رحمۃ اللہ علیہ۔

(۲) مولانا زکریا کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (شیخ الحدیث مدرسہ مظاہر علوم سہارن پور)

(۳) مولانا الیاس کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ، بانی تحریک دعوت وتبلیغ

(۴) مولانا شیخ محمد یعقوب مجددی رحمۃ اللہ علیہ (بھوپال)

یہ وہ اہم اور بنیادی عناصر تھے جن سے مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی شخصیت نکھر کر سامنے آئی اور وہ مرجع خلائق بنے۔

ثقافت اور تہذیب کیا ہے؟

ہمارا موضوع چونکہ ’’مغربی تہذیب کے تئیں مولانا علی میاں کا موقف ہے‘‘ اس لیے ضروری ہے کہ پہلے ہم ’’ثقافت وتہذیب‘‘ کا مفہوم ومعنی متعین کریں،اس کے بعد اس کے نقص یا خوبی پر بحث کریں،اس سلسلے میں حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ تحریر فرماتے ہیں:

’’جب ہم مذکورہ دونوں کلمات کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں ان کے مفہوم ومدلول کو سمجھنے میں ذرا بھی دقت اور پریشانی کا سامنا نہیں کرنا پڑتا ہے، بلکہ بات صاف سمجھ میں آجاتی ہے، چنانچہ ’’ثقافت‘‘ نام ہے ان علوم ومعارف اورنظریات کا جن میں مرورِ زمانہ اورگردشِ ایام کے ساتھ تبدیلی اور ارتقاء کا عمل ہوتا رہتا ہے،لیکن تہذیب کا قالب نظامِ

سیاست ومعیشت ،طرزِ رہائش، اقتصادی وسائل، علم وفہمِ انسانی اور درایت سے ڈھلتا ہے، گویا کہ ’’تہذیب وتمدن‘‘ دنیا کے اندر رہن سہن کے مختلف طریقوں سے عبارت ہے، لہٰذا جو بھی انسان اس عالم دوگیتی میں بستا ہے، وہ ولادت سے وفات تک ’’الحضارۃ‘‘ یعنی ’’تہذیب وتمدن‘‘ کو لازمی طور پر اختیار کرتا ہے، چاہے وہ تعلیم یافتہ ہو یا ناخواندہ، پڑھا لکھا ہو یا ان پڑھ‘‘۔

اسلامی تہذیب وتمدن ہی صحیح اور معیاری تہذیب وتمدن ہے:

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’اسلامی تہذیب وتمدن ہی صحیح ،معیاری اور مثالی تہذیب وتمدن ہے، کیوں کہ اس کی بنیاد توحید، رسالت، آخرت اور اچھے برے تقدیر کے سلسلے میں ایمانی موقف پر ہے، اسلامی تہذیب میں جزاء وسزا کا تصور ہے، وہ زندگی اور سماج کے صرف کسی ایک یا چند گوشوں میں مثالی کردار پیش نہیں کرتی ہے بلکہ ہر ہر گوشے اور ہر ہر سمت میں رہنمائی کرتی ہے، یہ اسلام کا اعجازی کارنامہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو ایسا جامع قانون، واضح دستور اور ایسی تہذیب اور ایسا تمدن دیا ہے جو برابر امت کی راہِ حق کی طرف رہنمائی کرتا رہتا ہے، ان کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے، ان سے پیچیدگی کو دور کرتا ہے، اور بند دروں کو وا کرتا ہے، چنانچہ اس میں ہر درد کی دوا ہے، ہر روگ کا علاج ہے، ہر زہر کا تریاق ہے۔

اسلامی تہذیب وتمدن کی ایک دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قانون وشریعت کی بقاء وتحفظ کے ساتھ اس کی نمائندگی کے لیے ایسے مردانِ کار کو بھی ہر دور میں بھیجا، جو صحیح معنوں میں تجدیدی شان رکھتے تھے، بڑے مصلح اور امت کے خیر خواہ تھے، جنھوں نے غلو پسندوں کی تحریف، باطل کے پرستاروں کی دعویداری اور جہلا کی بیجا تاویلات کو چھانٹ کر الگ کر دیا، چنانچہ یہ اسلامی تہذیب آج بھی زندہ وجواں سال ہے، جو مسلسل برگ وبار لا رہی ہے، جسے خزاں کے ظالم ہاتھ چھو بھی نہیں سکتے، ’’یہ اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا فطری طریقہ ہے، جس پر اللہ نے لوگوں کی تخلیق کی ہے، اور اللہ کی تخلیق میں کوئی تبدیلی نہیں کی جاسکتی، یہی درست طریقہ اور واضح دین ہے، اور لیکن زیادہ تر لوگ نہیں جانتے‘‘۔

ڈاکٹر عبدالسلام ازہری لکھتے ہیں: ’’اسلامی تہذیب وتمدن کی اساس خدائے واحد پر غیر متزلزل ایمان، عقل انسانی اور نفسِ انسانی کو دیومالائیت کے آہنی پنجوں سے آزادی دلانے، انسان کو انسانوں کی غلامی سے نکالنے، عالمی انسانی وحدت ویکجہتی کا قیام عمل میں لانے پر ہے، اور انسانیت کی فلاح وبہبود کے لیے مختلف میدانوں میں محبت وہمدردی، رافت ورحمت، یتیموں کی کفالت، کمزوروں کی اعانت، عورتوں کے حقوق اور ان کے وجود کی حمایت ونصرت، باہمی تعاون کے ذریعے تہذیب وتمدن کی تحریک کا قیام بھی ہے، جس میں سب کے لیے خیر اور بھلائی کے کام کیے جاتے ہوں، یہ بات اچھی طرح معلوم ہونی چاہئے کہ جب بھی کوئی تہذیب روحانی اور اخلاقی اعتبار سے دیوالیہ پن کا شکار ہوجاتی ہے، تو اس تہذیب کو زوال سے بلکہ ہلاکت سے کوئی چیز روک نہیں سکتی، اس اخلاق باختہ اور روحانیت سے عاری تہذیب کو بھی اسی طرح مٹنا پڑے گا، جس طرح عاد وثمود کی تہذیب مٹ گئی۔ اسی طرح صفحۂ ہستی سے اس تہذیب کے بھی اثرات ختم کر دیئے جائیں گے، جس طرح فرعون اور سبا کی تہذیب کے نقوش

ایک ایک کر کے ختم کر دیئے گیے ، جہاں تک مغرب کی اس تہذیب کا تعلق ہے جو خالص مادیت پر قائم ہے، وہ بھی سابقہ تہذیبوں کی روش پر بڑی تیزی سے گامزن ہے،اس لیے سنِ رشد کو پہنچتے پہنچتے وہ بھی ڈھیر ہوکر رہ جائے گی۔

(الامام ابوالحسن علی الحسنی الندوی ومنہجہ فی الفکر والدعوۃ والاصلاح،ص:۷۰)

مفکرِ اسلام حضرت مولانا سید ابوالحسن علی ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اسلامی تہذیب درحقیقت ایک دائمی انسانی تہذیب ہے،اس میں جسم وروح دونوں کا بڑے توازن اور جامعیت کے ساتھ خیال رکھا گیا ہے، وہ اسی طرح قائم ودائم رہنے والی تہذیب ہے،جس طرح آسمانی پیغام ہمیشہ باقی رہتا ہے،مولانا رحمۃ اللہ علیہ اپنی شہرۂ آفاق تصنیف ”ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین“ (انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر)میں متعدد غیرمسلم دانشوروں اور اسکالروں کی شہادتوں کے حوالے سے یہ بات کہی ہے کہ اسلامی تہذیب کے اثرات تمام مذاہب وادیان اور تہذیبوں پر دیکھے جاسکتے ہیں،مولانا ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے پنڈت جواہر لال نہرو کا یہ قول بھی نقل کیا ہے کہ ”انسانی مساوات کے تعلق سے مسلمانوں کا جو نظریہ ہے،اس نے ہندوؤں کے ذہن ودماغ پر بہت ہی گہرا اثر ڈالا ہے“۔

مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے پوری انسانیت کے ساتھ اسلام کے احسانات کو مختصراً چند نکات میں پیش کیا ہے، جو درج ذیل ہیں:

(۱) توحید کا صاف ستھرا عقیدہ، جس میں شرک وغیرہ کی کوئی ملاوٹ نہ ہو۔
(۲) انسانی وحدت ومساوات۔
(۳) انسان کی عزت وسربلندی کا اعلان۔
(۴) خواتین کے وقار واعتبار کی بحالی اور ان کے لیے بھی حقوق وحصہ داریوں کی فراہمی۔
(۵) مایوسی اور بدفالی سے کھلی جنگ اور امید واعتماد کی فضا کا قیام۔
(٦) دین ودنیا کی جامعیت۔
(۷) مذہب وسائنس کے درمیان مقدس رشتے کی استواری۔
(۸) دینی مسائل ومعاملات میں عقل وآگہی کا استعمال۔
(۹) عقیدہ اور تہذیب کی وحدت۔**(الاسلام وفضلہ علی الحضارۃ للعلامہ الندویؒ)**

مغربی تہذیب کی اساس اور اس کا آغاز

اسپین کی تاریخ سے استفادے نے ایک طرف مغرب کو اپنی طویل خرمستی وخواب سے بیدار کیا،یہیں سے اس کی ترقی کا آغاز ہوا،اور یورپ نے حکومت واقتدار پر غلبہ حاصل کرلیا، اور تھوڑی ہی مدت میں تعمیروترقی کی چوٹی پر پہنچ گیا،اور اس تہذیب نے قدیم یونانی تہذیب کو پورے طور پر اپنا لیا۔مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے یوروپ کے افکار کو مختصراً چار نکات میں پیش کیا ہے:

(۱) محسوس پر ایمان اور محسوس اشیاء کے اندازے میں کمی۔
(۲) خشوع وخضوع کا فقدان۔
(۳) زندگی کا بڑا اہتمام اور اس کی لطف ولذت کا ضرورت سے زیادہ خیال۔
(۴) قوم پرستی کا رجحان۔

چنانچہ آپ غور کریں تو آپ کو پوری طرح محسوس ہوجائے گا کہ ’’مادیت‘‘ وہ جامع لفظ ہے جس پر یورپ کا بڑا پختہ ایمان ہے، یورپین اقوام جس ’’کلمہ‘‘ کا سب سے زیادہ ذکر کرتے ہیں وہ ہے ’’پیٹ‘‘ اور ’’معدہ‘‘ اور قرآنی تعبیر میں اس کی ترجمانی اس طرح بھی کی جاسکتی ہے "**إن هي إلا حياتنا الدنيا، نموت ونحيا، وما نحن بمبعوثين**" ترجمہ:’’ہماری زندگی تو بس دنیا کی زندگی ہے، ہم مرتے ہیں اور جیتے ہیں، ہمیں دوبارہ اٹھایا بھی نہیں جائے گا‘‘۔ مادیت کا عنوان بہت ہی روشن اور اس کا جسم بڑا آب دار ہے، اس کے اندر ایسی قوتِ کشش پائی جاتی ہے، جو ہر ایک کو اپنے دام میں پھانس لیتی ہے اور اپنی طرف کھینچ لیتی ہے، نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ’’جنت کو ناپسندیدہ اور ناگوار چیزوں سے گھیر دیا گیا ہے اور جہنم کو شہوتوں سے‘‘۔ یہی حالت ہے اس ’’مادیت‘‘ کی جس کا یورپ حریص ہے اور جو یوروپین اقوام کی رگ و پے میں رچ بس گئی ہے۔

حضرت مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی اور تمدنی خرابیوں کی بیخ کنی

انیسویں صدی کے وسط میں مغرب نے عالمِ اسلام پر حملہ کیا، اور یہ حملہ انتہائی زبردست اور دوررس اثرات کا حامل تھا، اس حملے کے مقابلے کے لیے فکرونظر میں وسعت و گہرائی، دقیقہ رسی وباریک بینی اور جرأت وشہامت کی ضرورت تھی، اور اس دور کے مفکرین وقائدین میں یہ چیزیں تقریباً مفقود نظر آتی تھیں، اس مغربی حملے کے مقابلے کے لیے مشرق میں جو ستارہ طلوع ہوا وہ علامہ جمال الدین افغانی کی ڈائنامیکی (تحریکی) شخصیت تھی۔ لیکن ان پر سیاسی رنگ کا غلبہ تھا، چنانچہ علامہ افغانی کی پوری توجہ اسلامی ممالک کو مغربی سامراج کے چنگل سے آزاد کرانے پر تھی، اور علامہ افغانی کے نامور شاگرد مفتی محمد عبدہ کا موقف بھی دفاعی انداز کا تھا، جس کی وجہ سے انھوں نے اسلام کے بعض مسلمہ حقائق کی بھی تاویل کی، اب امیدیں ’’اخوان المسلمون‘‘ سے وابستہ تھیں، لیکن ان کی راہ میں بھی بہت سی رکاوٹیں پیدا ہوگئیں، برصغیر میں معروف شاعر اکبرالہ آبادی نے بھی مغربی تہذیب وتمدن پر زبردست یلغار کی، اپنی چبھتی ہوئی طنزیہ شاعری سے اس پر زوردار تنقید کی، مگر یہ اسلوب ہمیشہ اور ہر دور کے لیے موزوں نہیں تھا، علامہ اقبال نے بھی مورچہ سنبھالا، مگر علامہ کی تنقید اور حملوں کا دائرہ بھی بہت وسیع نہ ہوسکا، کیوں کہ علامہ کے حملے اور تنقید سب اردو اور فارسی زبانوں میں تھے، علماء کے طبقے میں مولانا ابوالاعلیٰ مودودی رحمۃ اللہ علیہ نے پورے اعتماد ویقین کے ساتھ اس دجالی تہذیب اور یورپین یلغار کا مقابلہ کیا، اپنے زبردست مقالات اور طاقتور تحریروں کے ذریعہ اسلام پر مسلمانوں کا بطورِخاص مسلم نوجوانوں کا اعتماد بحال کیا، لیکن اصولِ شریعت اور اساسیاتِ دین کے اندران کی طرف سے بعض ایسے آراء وافکار سامنے آئے جن کی وجہ سے وہ علماء کے درمیان مختلف فیہ ہوگیے، اور ان کی تحریک کا دائرہ بھی ایک محدود حلقے میں سمٹ کررہ گیا۔

ایسے ماحول میں دنیا کو ایک ایسی شخصیت کا انتظار تھا جن میں وسطیت واعتدال ہو، جن کے پاس فکرِ ارجمند کے ساتھ زبانِ ہوشمند ہو، اور عربی زبان وبیان پر اعلیٰ درجہ کی قدرت بھی، وہ شخصیت زہدوقناعت، اخلاص وللّٰہیت اور اخلاق وکردار کی دنیا میں بھی مثالی شان رکھتی ہو، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے زمانے کی ضرورت اور حالات کے تقاضے کے مطابق مولانا علی

میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ کی ذات میں اس مطلوب ومنتظرعبقری شخصیت کوجلوہ گرفرمادیا۔

مفکرِ اسلام مولانا علی میاں ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے قوموں کے عروج وزوال کا گہرا مطالعہ کیا تھا، مغربی تہذیب کے مالہ وماعلیہ کواچھی طرح سمجھا تھا، اس لیے علامہ ندویؒ نے حیات بخش نسخے تجویز فرمائے اور مسائل کا اطمینان بخش حل پیش فرمایا، دیگر شخصیات کی طرح عمومی تنقید کا رویہ اختیار نہیں کیا، بلکہ دکھتی ہوئی رگوں پہ ہاتھ رکھا، ایک ایک ملک، ایک ایک سلطنت اورمقتدر شخصیت کوخطاب کیا، انھیں مخاطب کر کے اپنی بات پہنچائی، خیر کا اعتراف کیا، بھلائیوں کی نشاندہی کی، اوراس خطرے سے بھی آگاہ کیا، جو پوری پوری سلطنت کواپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا، مولانا نے اپنی تقریر وتحریر کے ذریعے ہر باغیرت انسان کے ضمیر کوجھنجھوڑا، انھیں آواز دی، تاکہ عالمِ اسلام سے اس احساسِ کمتری کا خاتمہ ہوجائے، جس نے ہر بڑے چھوٹے کواپنے شکنجے میں کس لیا تھا۔

مغربی تہذیب کے تئیں تین الگ الگ موقف

جب مغرب کے اندر مادیت کا جادوسر چڑھ کر بولنے لگا، ہر ہر چیز کولوگ اسی عینک سے دیکھنے لگے، روحانیت کوسماج سے پوری طرح بے دخل کردیا گیا، اورغیرشعوری طور پر لوگ مادیت کے دلدادہ اورروحانیت سے بیزار ومتنفر ہوگیے تولوگ اس تہذیب کے تئیں دوفریقوں میں بٹ گئے:

(۱) ایک فریق نے تو مغرب کے اس مادی نظریہ کو پوری طرح مسترد کردیا اورخود کواس سے ایک دم الگ تھلگ کرلیا۔

(۲) دوسرے فریق نے اس مغربی نظریہ کو''من وعن'' قبول کرلیا اوراس کے سامنے سپرڈال کربیٹھ گیے۔

مفکرِ اسلام مولانا ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:''اس وقت پورے عالمِ اسلام میں ایک فکری کشمکش بلکہ زیادہ بہتر تعبیر میں فکری معرکہ آرائی اور جنگ قائم ہے، ہم برملا کہہ سکتے ہیں کہ یہ کشمکش اور جنگ درحقیقت اسلامیت اورمغربیت کی کشمکش ہے، یہ محاذ آرائی انھیں دونوں نظریات کے درمیان قائم ہے''۔ مزید علامہ ندوی رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرماتے ہیں کہ''عالمِ اسلام کوانیسویں صدی کے وسط میں ایک زبردست قضیہ اورسنگین مسئلے کا سامنا کرنا پڑا اوروہ مسئلہ جواں سال وطاقتوراورحیات ونشاط سے بھرپور، غلبہ واقتدار کے اسلحے سے مسلح مغربی تہذیب کا مسئلہ تھا، اسلام اورمسلمانوں کواس حساس اور بلاخیز مسئلے سے رو در روسابقہ پڑا تھا، اس وقت عالمِ اسلام کے قائدین ومفکرین کے سامنے تین راستے تھے جن کے ذریعے وہ اس کو فیس(Face) کرسکتے تھے۔

پہلا موقف منفی تھا

اوروہ یہ ہے کہ عالمِ اسلام اس کوپوری طرح مسترد کردیتا اوراس سے متعلق ووابستہ تمام چیزوں کوبھی اٹھا کر پھینک دیتا، یہ موقف ایک انتہائی پُرجوش اوربھڑکیلے قسم کے مخالف کا موقف ہوتا، جس میں عقل ودانشمندی اورہوش کی کوئی جگہ نہیں ہے۔

دوسرا موقف

دوسرا موقف مکمل خودسپردگی اوربے بسی کا موقف تھا، جوایک مقلدِ محض کا موقف ہوتا ہے، اس موقف کا مطلب یہ ہوتا کہ عالم اسلام اس کوپوری طرح قبول کرلیتا، اس کے

افکاروخیالات کوبھی، عقائد واعمال اوررجحانات کوبھی، ظاہر ہے کہ یہ موقف اول الذکر موقف سے زیادہ خطرناک اورہولناک ہے،اس دوسرے موقف کی وجہ سے تو پوری اسلامی تہذیب اوراسلامی تشخص سب کا یکلخت خاتمہ ہی ہوجاتا۔

تیسرا موقف

تیسراموقف "خذ ما صفا ودع ما كدر" کا تھا،اوریہی علامہ ابوالحسن علی حسنی ندوی رحمۃ اللہ علیہ کا موقف ہے،مولانا نے اسی کی نمائندگی کی اور اسی موقف کو اختیارکرنے پرزوردیا۔مولانا کی ساری تگ ودو، ساری جد وجہد،مولانا کی اکثرتحریریں،تقریریں،کتابیں اسی موقف کی وضاحت کرتی ہیں۔

(الصراع بين الفكرة الاسلامية والفكرة الغربية في الاقطار الاسلامية)

مغربی تہذیب کی تنقید کےموضوع پرعلامہ ندویؒ کی تصنیفات

(۱) **ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمين** (انسانی دنیاپرمسلمانوں کےعروج وزوال کااثر)

(۲) **أحاديث صريحة في أمريكا** (امریکہ سے صاف صاف باتیں)

(۳) **الصراع بين الفكرة الاسلامية والفكرة الغربية في الأقطار الاسلامية** (اسلامی ممالک میں اسلامیت ومغربیت کی کشمکش)

(۴) **إلى الإسلام من جديد**

(۵) **حديث مع الغرب**

(۶) **الحضارة الغربية الوافدة كما يراها الشاعر أكبر الإله آبادي**

(۷) **ردة ولا أبا بكر لها**

(۸) **الصراع بين الإيمان والمادية** (ایمان ومادیت کی کشمکش)

مغربی تہذیب کے مقابلے کے لیےمولانا ندویؒ کےنمایاں نکات

(۱) اساسیاتِ دین پرپختہ ایمان

(۲) اخلاص وجاں نثاری

(۳) قدیمِ صالح اورجدیدِ نافع کے درمیان امتزاج

(۴) حقیقت پسندی اورمیانہ روی

(۵) واضح تنقیداورعمیق تجزیہ

(۶) انسائیکلوپیڈیائی منہج اورشمولیت

مولانا کی وفات پرعرب وعجم کی بڑی بڑی شخصیات نے اپنے خیالات کا اظہارکیااورآپ کی عالمی خدمات کوسراہا اوران کوخراجِ تحسین پیش کیا۔

ڈاکٹراحمد التویجری نے کہا: شیخ کی زندگی دعوت الی اللہ، اسلام کا دفاع اور ہرجگہ خیر کی نشرواشاعت کے لیے جہد مسلسل سے عبارت تھی،آپ نے غیراسلامی فکری طوفانوں کا ثابت قدمی سے مقابلہ کیا، اوراسلام کے محاسن کواجاگر کیا اوراس کولوگوں کے دلوں میں جاگزیں کیا،انھوں نے دنیا بھرکا سفرکیا تاکہ دلوں کوحرارت بخشیں اورلوگوں کے درمیان الفت ومحبت پیدا کریں، وہ وحدتِ امت کی طرف بلانے والے داعیوں میں سب سے بڑے داعی تھے، وحدتِ اسلامی کی دعوت اورالحاد کا مقابلہ کرنے کے سلسلے میں آپ کے بڑے کارنامے ہیں جس کے گواہ شاہ فیصل مرحوم بھی ہیں۔آپ کی تالیفات سے اگرچہ اسلامی لائبریری کی کئی الماریاں مزین

ہیں جن کا شمار بہترین فکری اور تربیتی کتابوں میں ہوتا ہے لیکن میرے نزدیک ان کی عملی سیرت اور اخلاقی کردار یہ دونوں وصف انتہا پر تھے اور یہی وہ میراث ہے جس کو وہ امتِ مسلمہ کے لیے چھوڑ گیے ہیں۔ اور میں بغیر تردد کے ان کو حسن بصری، فضیل بن عیاض اور عبد القادر جیلانی رحمہم اللہ کی صف میں شمار کرتا ہوں۔

پروفیسر فرحان نے کہا: علامہ عربی النسل اور فصیح البیان تھے اگرچہ وہ پیدا ہندوستان میں ہوئے وہ ''مجمع اللغۃ العربیۃ'' دمشق کے رکن، عربی زبان کے عاشق اور اس کے ماہر تھے کیونکہ عربی قرآنِ کریم کی زبان ہے، عربی زبانوں میں انھوں نے کتابیں لکھیں، علمی مجلسوں میں اور عربی لوگوں میں مصر، شام، اردن، عراق اور سعودی عرب میں لکچرز دیئے۔ علامہ ندوی نے ''رابطہ ادبِ اسلامی'' کی بنیاد ڈالی کیونکہ ان کو امتِ اسلامیہ کی زندگی کے فکری وثقافتی میدان میں ادبِ اسلامی کے دور کی اہمیت کا ادراک تھا، انھوں نے خود دسیوں کتابیں اسلامی فکر، دعوت وتبلیغ اور ثقافت پر تحریر کیں جن میں سب سے نمایاں کتاب ''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین'' ہے جسے ہر داعی، ہر پڑھے لکھے اور دعوتی کام کرنے والے شخص نے پڑھا ہے۔

شیخ ابوالحسن علی ندوی کا شمار اسی سال وفات پانے والے ممتاز علماء اور مصلحین میں ہوتا ہے، مثلاً ابوالاعلیٰ مودودی، حسن البنا، علی الطنطاوی اور شیخ محمد الغزالی، یہ سب روشنی کے مینار تھے جن سے روشنی حاصل کی جاتی تھی اور موجودہ اسلامی فکر کے مجدد تھے اور موجودہ عہد کی اسلامی نشاۃ ثانیہ کے معمار تھے۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو امتِ اسلامیہ کی طرف سے بہترین صلہ عطا فرمائے''۔

ڈاکٹر خلیل حماد، استاد ملک سعود یونیورسٹی ریاض نے کہا'' شیخ ابوالحسن علی ندوی مرحوم کی دعوت الی اللہ کے سلسلے میں واضح خدمات اور انمٹ نقوش ہیں۔ ان کا ایک خاص اسلوب ہے جس سے وہ پہچانے جاتے ہیں، وہ دعوت الی اللہ میں ایک نمایاں مدرسۂ فکر کی نمائندگی کرتے ہیں۔ انھوں نے مولانا مودودی کے ساتھ اسلام کی اشاعت میں اس وقت حصہ لیا جب اسلام غیر منقسم ہندوستان میں کمزور تھا، ہم اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ وہ ان پر رحم وکرم فرمائے اور ان کی مغفرت فرمائے اور ان کو جنت الفردوس میں جگہ دے۔

قدرت کی فیاضیوں نے حضرت مولاناؒ کو آبِ زم زم کی طرح پاک وصاف دل، آسمان کی طرح بلند وبالا دماغ، آفتاب کی طرح روشن نظر اور سمندر کی طرح وسیع علم، شہد کی طرح میٹھی زبان اور پھولوں کی سی شگفتگی عطا فرمائی تھی۔ اسی طرح مولانا علی میاںؒ نے جو زندگی گذاری ہے اور جو نقوش چھوڑے ہیں وہ پوری امتِ مسلمہ کے لیے چراغِ راہ اور سرمایۂ حیات ہیں۔ اگر مسلمانانِ عالم خصوصا علماء واہلِ نظر مولاناؒ کے طریقۂ کار کو اپنا وظیفۂ حیات بنالیں تو پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ عالمِ اسلام میں ایک انقلاب رونما ہوسکتا ہے۔ (انشاء اللہ)

مختصر یہ کہ حق تعالیٰ نے مولاناؒ کو جن فطری خصائص و کمالات اور امتیازی اوصاف وخصوصیات سے نوازا تھا ان کا احاطہ کرنا اور ان کے ہشت پہلو کو نمایاں کرنا بڑا دشوار ہے ؎

ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے
سفینہ چاہئے اس بحر بیکراں کے لیے

عربی کے مشہور ادیب احمد امین کی خودنوشت سوانح ’حیاتی‘۔ ایک مطالعہ

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

عربی زبان میں خودنوشت سوانح عمریاں بہت سی موجود ہیں۔عہدِ جدید میں احمد امین کی ’’حیاتی‘‘ اور طہٰ حسین کی ’’الایام‘‘ نے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی ہے۔ راقم السطور نے دونوں کتابوں کا بالاستیعاب مطالعہ کیا ہے، اور وہ اس نتیجے تک پہنچا کہ صرف گل افشانیٔ گفتار اور ادب وانشا کے معیار کو سامنے رکھا جائے تو ’’الایام‘‘ زیادہ وزن دار کتاب ہے۔اسی لیے اس نے مقبولیت کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے ہیں، اس کتاب میں طہٰ حسین کی تحریر بغیر شراب کا نشہ ہے، لیکن کسی کتاب کی افادیت اور اہمیت صرف ادب وانشا کے معیار کو سامنے رکھ کرنہیں طے کی جاسکتی ہے۔زندگی کے تجربات اور علمی وفکری خصوصیات اور شخصیت کی تشکیل کے لازمی عناصر اور ان کے فائدے کو معیار بنایا جائے تو ’’حیاتی‘‘ کا درجہ ’’الایام‘‘ سے بہتر اور بلند تر ہے۔ طہٰ حسین کی ’’الایام‘‘ تو وہ کتاب ہے جس کو اگر پوری قوت سے نچوڑا جائے تو شگفتہ بیانی اور لن ترانی کے سوا علم وتحقیق کا کوئی قطرہ اس سے مشکل سے برآمد ہوگا۔جبکہ ’’حیاتی‘‘ میں قدم قدم پر زندگی کے قیمتی اور انمول تجربات سامنے آئیں گے، جن سے ایک باذوق قاری کا دامن علم وفکر کے بیش بہا موتیوں سے بھر جائے گا۔خالص ادبی نقطۂ نظر سے بھی یہ کتاب ’’الایام‘‘ کے ہم پلہ نہ سہی لیکن بہت وقیع اور خوبصورت ہے، بہت سی جگہوں پر احمد امین نے اپنی شیریں گفتاری کا جادو جگایا ہے، اور یہ اندازہ ہر اس شخص کو ہوگا جس نے عربی زبان میں ’’حیاتی‘‘ کا مطالعہ کیا ہے۔مجموعی اعتبار سے ’’حیاتی‘‘ میرے نزدیک ’’الایام‘‘ سے زیادہ پسندیدہ اور مفید کتاب ہے۔اردوخواں حضرات کو بات سمجھانے کے لیے مولانا آزاد کی کتابوں کا حوالہ دیا جاسکتا ہے۔مولانا آزاد کی ایک کتاب ’غبارِ خاطر‘ ہے، یہ خالص ادبی کتاب ہے، اور اردو انشا کے لحاظ سے زرِکامل عیار کی حیثیت رکھتی ہے۔مولانا آزاد کی کتابوں میں اسی کتاب کے سب سے زیادہ ایڈیشن نکلے ہیں، لیکن علم وآگہی اور فکر وتحقیق کے اعتبار سے مولانا آزاد کی دوسری کتابوں جیسے ’تذکرہ‘ یا ’ترجمان القرآن‘ کا پایہ زیادہ بلند ہے، اور اس میں ادب کا جمال بھی موجود ہے، اور ان دونوں کتابوں کی افادیت اور اہمیت ’غبارِ خاطر‘ سے کہیں زیادہ ہے۔لیکن مقبولیت زیادہ غبارِ خاطر کو حاصل ہوئی۔

’’حیاتی‘‘ میں بھی ادب کا جمال موجود ہے، لیکن جس

طرح لیلائے شب کی زلفِ برہم میں دمکتے ہوئے ستاروں کا حسن دیکھنے کے لیے بینائی کی شرط ہے،اسی طرح عربی زبان کی کسی کتاب کے ادبی حسن سے آشنا ہونے کے لیے عربی زبان کا جاننا بھی ضروری ہے۔''حیاتی'' کی ادبی حیثیت بھی مسلم ہے، کتاب میں جو لطائف اور معانی ہیں اور جو افکارواقدار پیش کیے گیے ہیں وہ مستزاد ہیں۔

احمد امین عربی کے بہترین نثر نگار،فن کار،سوانح نگار، معلم ومؤرخ، یونیورسٹی کے استاذ اورعربی ادب کے نقاد تھے۔ احمد امین بایں ہمہ قابلیت وعبقریت مجدد اور مصلح نہیں تھے،اور نہ انقلابی شخصیت کے حامل تھے۔ان کی مثال اس موسیقی کار کی طرح ہے جوکسی بستی میں آگ لگنے کے باوجود آگ بجھانے کی فکر نہ کرے اوربستی کے نزدیک درخت کے سایے میں بیٹھ کر بانسری بجاتا رہے، ان کے والد نے اسی انداز سے ان کی تربیت کی تھی، ان کے والد درسی کتابوں کی تدریس وتفہیم کے ماہر تھے لیکن اخبارات کے مطالعے سے اور سیاست سے گریزاں رہتے، گردوپیش میں کوئی بیماری پھیل جائے یا سیلاب آجائے یا زلزلہ آجائے وہ ان سب سے بے نیاز مطالعے میں یا اپنے معمولات میں، یا گھریلو فرائض میں مشغول رہتے۔احمد امین نے اسلامی تاریخ اوراس کے مدوجزر کا تفصیلی لیکن معروضی مطالعہ کیا تھا،اور ایک نہیں بلکہ متعدد کتابیں اس موضوع پر لکھیں، ان پر یہ مصرعہ صادق آتا ہے''داستانِ فصلِ گل خوش می سرائد عندلیب''، ان کا مزاج خالص عقلی، علمی اور فکری تھا۔ وہ سبک سارانِ ساحل کی طرح دور سے طوفاں کا نظارہ کرتے تھے، وہ جمال الدین افغانی کی طرح انقلاب بردوش شخصیت نہیں رکھتے تھے، اسی لیے مسلمانوں کے زوال اور یورپ کے عروج واقبال سے ان کا دل ویسا بے چین نہیں ہوتا تھا جیسا برِصغیر میں علامہ اقبال کا یا مولانا مودودی کا ، یا مولانا ابوالحسن علی ندوی کا، یا مصر میں سید قطب شہید کا دل بے چین اور مضطرب رہتا تھا۔اقبال کا سارا کلام،مودودی صاحب کی''تنقیحات''وغیرہ مختلف تحریریں، اور علی میاں کی کتاب ''انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر''اور سید قطب کی''جاہلیۃ القرن العشرین'' ، یہ کتابیں ان حضرات کے اضطراب کی آئینہ دار ہیں، یہ اضطراب بڑی نعمت اوراللہ تعالی کا انعام ہے،اور ہر شخص کو میسر نہیں ہوتا،اسی لیے اقبال نے شکوہ کیا تھا۔

خدا تجھے کسی طوفاں سے آشنا کردے
کہ تیرے بحر کی موجوں میں اضطراب نہیں

احمد امین کے کئی اسفار کا اس خودنوشت میں تذکرہ ہے،اس میں ترکی کا سفرنامہ بھی ہے، مصطفیٰ کمال نے جوترکی کا حلیہ بگاڑا تھا،اوراس کا قبلہ یوروپ کی طرف کردیا تھا،اس کا بس سرسری تذکرہ ہے،لیکن مصطفیٰ کمال پر جوتاریخ اسلام کے بڑے مفسدین میں شمار کیے جانے کے لائق ہے،کوئی نقد اور کوئی تبصرہ نہیں ہے۔کیونکہ یہ بگاڑ احمد امین کے ٹھنڈے مزاج کو برہم نہیں کرسکا۔ان کی طبیعت تالاب کے پانی کی ساکن سطح کی طرح ہے کہ جس میں کوئی تموج اور تلاطم نہیں ہے، ان کا مزاج ملی اوراجتماعی معاملات میں ان کے اپنے چوبِ قلم کی طرح خشک ہے اوریخ بستہ ہے، یہی وجہ ہے کہ احمد امین کی علمی منزلت کی وجہ سے مولانا علی میاں نے اپنی کتاب''ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین''پر مقدمہ کی فرمائش کی تو انہوں نے مقدمہ تو لکھا،لیکن کتاب کی حرارت اور مقدمہ کی برودت کے

درمیان تضاد پایا گیا، اورلوگوں نے محسوس کیا کہ اس مقدمہ نے کتاب کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچایا ہے، اور جب سید قطب نے کتاب پراس کی روح کے مطابق طاقتور مقدمہ لکھا تو اس نقصان کی تلافی ہوئی اور پھر آئندہ ایڈیشن سے احمد امین کے مقدمہ کو ہٹا دیا گیا۔

ان سب کے باوجود احمد امین کی علمی وادبی حیثیت مسلم ہے۔ اگر چہ طہٰ حسین کے حلقوں نے ان کی ادبی حیثیت کا اعتراف نہیں کیا ہے، اور طہٰ حسین کے شاگردِ رشید شوقی ضیف نے مصر کے ادبا پر اپنی کتاب میں ان کا نام ہی غائب کر دیا، یہ حلقہ ان کو مؤرخ اور محقق تو سمجھتا ہے لیکن ادیب نہیں۔ اس حلقے کے لوگ ادب کو شعر وافسانہ میں محصور سمجھتے ہیں، طہٰ حسین کے نزدیک حقیقی ادب بس یہی ہے، اس طرح کے نثری ادب کے لیے انہوں نے ''الادب الانشائی'' کی تعبیر اختیار کی ہے، باقی تاریخ ادب اور نثر کے دیگر اصناف کو انہوں نے ''الادب الوصفی'' کہہ کر حقیقی ادب کے دائرے سے خارج کر دیا ہے۔ اردو داں حلقے کے سمجھنے کے لیے اسے اس طرح سے کہا جاسکتا ہے کہ طہٰ حسین کے نزدیک شبلی کی شاعری کو یا شعر العجم کو ادب کے دائرے میں رکھا جاسکتا ہے لیکن سیرت النبی، الفاروق، اور سیرۃ النعمان جیسی کتابیں ان کے نزدیک ادب کے دائرے سے باہر ہوں گی۔

ضروری نہیں کہ طہٰ حسین کی بات صحیح مانی جائے لیکن جو بات مسلم ہے اور جس کا اعتراف کیا جانا چاہئے وہ یہ کہ 'الایام' کی ادبی حیثیت اپنی جگہ پر لیکن احمد امین کی خودنوشت ''حیاتی'' علمی وفکری اعتبار سے زیادہ معتبر، مؤقر اور مفید تر کتاب ہے۔ اس میں ادب کی چاشنی کے ساتھ فکر وعقل کی غذا کا بھی پورا سامان ہے۔ اس کتاب کی زبان وبیان کے حسن کا اعتراف عباس محمود العقاد جیسی شخصیت نے کیا ہے۔ لیکن یہ بھی صحیح ہے کہ احمد امین ادیب سے زیادہ محقق اور مؤرخ تھے۔ ادیب اور شاعر بننے کے لیے جذباتیت ضروری ہے، جس کا تعلق دل سے ہے، لیکن محقق بننے کے لیے منطقیت اور سرگرمِ جستجو ہونا ضروری ہے اور اس کے لیے عقلیت لازمی ہے جو احمد امین کے یہاں وافر مقدار میں پائی جاتی ہے۔

احمد امین وہ سب کچھ بنے جو قدرت نے انہیں بنانا چاہا، انسان کی شخصیت کی تشکیل میں غیبی ہاتھ کام کرتے ہیں، اور انسان کو ادھر لے جایا جاتا ہے جدھر قدرت اسے لے جانا چاہتی ہے، اور قدرت انسان کو کدھر لے جانا چاہتی ہے کوئی بھی انسان چاہے پیغمبر ہی کیوں نہ ہو اس وقت تک نہیں سمجھ سکتا ہے جب تک کہ وہاں پہنچ نہیں جاتا ہے۔ یوسف علیہ السلام کے لیے تقدیرِ الٰہی کا فیصلہ تھا کہ مصر کے تاج وتخت کا ان کو وارث بنایا جائے، انہیں کنویں میں اسی لیے ڈالا گیا کہ مصر جانے والے مسافر انہیں کنویں سے نکال کر مصر لے جائیں اور پھر مصر کے بازار میں انہیں غلام بنا کر اسی لیے فروخت کیا گیا کہ وہ اس بازار سے عزیزِ مصر کے گھر پہنچ جائیں۔ یہی وہ حقیقت ہے جس کی طرف اقبال نے اشارہ کیا ہے کہ '' بیچارہ پیادہ تو ہے اک مہرۂ ناچیز☆فرزیں سے بھی پوشیدہ ہے شاطر کا ارادہ''۔

شاطرِ قدرت نے ان کے لیے جو طے کیا تھا وہ ان کو ملا، یہ دنیا عالمِ اسباب ہے، منزل تک پہنچنے کے لیے انہوں نے طویل سفر کیا، نہ تھکن کا احساس کیا، نہ انہوں نے پاؤں کے چھالے دیکھے، انہیں معلوم تھا کہ زندگی لہو ترنگ ہے

جلترنگ نہیں ہے۔انھوں نے ہمت اور مسلسل عمل سے ساحلِ مراد تک پہنچنے کی کوشش کی، انھوں نے ریگزار کو چمن اور بنجر زمین کو گل وگلزار بنایا، کتابیں ان کے لیے دن کی رفیقِ حیات اور رات کی رانیاں تھیں، انھوں نے علمی اور ادبی کاموں میں بے انتہا محنت کی، مسلسل اور بلا انقطاع پڑھنے اور لکھنے کی عادت نے علم ودانش کی دنیا میں ان کی شناخت قائم کردی، صاحبانِ نقد ونظر کی نگاہیں ان پر پڑنے لگیں، پہلے جج بنے، پھر لکچرر بنے اور پھر پروفیسر اور پھر پرنسپل اور پھر شعبۂ تصنیف وتالیف کے ڈائرکٹر بنے، اعزازات سے نوازے گیے۔ دوسرے ملکوں کی علمی کانفرنسوں میں اپنے ملک کی نمائندگی کی، علم وادب کی دنیا میں انھوں نے اپنے مستقبل کو درخشاں بنایا، اور جریدۂ عالم پر انھوں نے نام اور دوام دونوں کو ثبت کردیا۔ عربی زبان وادب اور اسلامیات سے شغف رکھنے والے صرف ''حیاتی'' کو نہیں بلکہ ''زعماء الاصلاح''، ''فجر الاسلام''، ''ضحیٰ الاسلام'' اور ''النقد الادبی'' وغیرہ کو کبھی فراموش نہیں کرسکیں گے اور ان کی کتابیں گردش شام وسحر کے درمیان زندہ اور تابندہ رہیں گی۔

سوانحی ادب کا مطالعہ دوسروں کے قیمتی تجربات سے مفت فائدہ اٹھانے کے مرادف ہے، اگر مطالعہ کی عادت ہو تو انسان مشاہدے سے زیادہ مطالعے سے فائدہ اٹھا سکتا ہے، انسانی زندگی پر ایک طرف قانونِ وراثت اپنا کام کرتا ہے، دوسری طرف حالاتِ زندگی کا اس پر عکس پڑتا ہے۔ جب ایک انسان عظیم شخصیتوں کے تجربات اور تاریخ ساز، بلند قامت انسانوں کے حالات پڑھتا ہے تو یہ مطالعہ گزرگاہِ حیات میں اس کے لیے قندیل کا کام کرتا ہے، اور وہ ان سے اکتسابِ نور کرتا ہے۔مثال کے طور پر اس کتاب کے مطالعے سے ایک قاری کو یہ سبق ملے گا کہ بچوں کی تربیت کس درجہ اہتمام کے ساتھ کرنا چاہئے اور ان کے اندر علم وادب کی تخم ریزی کس طرح کرنی چاہیے، اور خود اپنی زندگی کو اولاد کے لیے کس طرح نمونہ بنانا چاہئے، حیا اور سنجیدگی اور غم کی زیریں لہر شخصیت کی تشکیل میں کس قدر مفید ہوتی ہے، دینی ماحول اور قرآن کی تلاوت سے گھر کا ماحول کس قدر نورانی بنتا ہے۔ کتاب سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ معیارِ زندگی کے ریس وہ لوگ کرتے ہیں جو نانجار اور ساقط الاعتبار ہوتے ہیں، مسابقت کا جذبہ معیارِ زندگی کے لیے نہیں معیارِ بندگی کے لیے ہونا چاہئے، تعلیم وتدریس کو ایک بوجھ بنانے کے بجائے طلبہ کے لیے مرغوب شربت کا گلاس بنا کر پیش کرنا چاہئے، گندگی اور غلاظت گھر کے اندر ہو یا باہر ہو اس سے وہ ذوقِ جمال مردہ ہوتا ہے جو اللہ تعالی کی نعمت ہے اور اس نعمت کی حفاظت ضروری ہے، ورنہ مزاج میں بدسلیقگی پیدا ہوجاتی ہے، ذوقِ جمال کی تربیت کے لیے پھولوں کے حسن اور مناظرِ قدرت سے رغبت پیدا کی جانی چاہئے، صالح انسان کی صحبت انسان کو صالح بناتی ہے، زندگی اور زبان دونوں میں شگفتگی لانے کے لیے ادبی وشعری ذوق ضروری ہے، کسی بھی کام میں محنت، صبر اور تحمل کامیابی کا زینہ ہے۔اس طرح کے بے شمار لعل وگہر اور حکمت کے موتی ورق ورق پر چمکتے نظر آئیں گے۔ مصنف نے یہ کتاب کیا لکھی ہے گویا موتی رولنے اور آبِ حیات گھولنے کا کام کیا ہے۔ ان کی کتاب اس خوبصورت قبا کے مانند ہے جس پر گل بوٹے سجائے گیے ہوں۔

☆☆☆☆☆☆

علامہ شبلی نعمانی رحمۃ اللہ علیہ کی نظموں میں ملت کی دردمندی کا تذکرہ

اقبال احمد ندوی
استاد دارالعلوم ندوۃ العلماء، لکھنؤ

شاعری ایک ایسی زبردست قوت ہے، جو قوموں کو زیروزبر کرسکتی ہے،حکومتوں کو ہلاسکتی ہے اور ملکوں میں ہلچل ڈال سکتی ہے۔یہی وہ شعلۂ جوالہ ہے، جس سے عرب قبائل میں جنگ کی آگ بھڑک اٹھتی تھی اور یہی وہ دردانگیز نالہ ہے، جس سے نوحے کے وقت درودیوار سے آنسو نکل پڑتے تھے۔ اسی کے ساتھ شاعری سے ہر زمانے میں مفید کام بھی لیے جاتے رہے ہیں اور آج بھی لیے جاسکتے ہیں۔ اس سے معاشرے کی اصلاح ہوسکتی ہے۔اخلاق اور شریفانہ عادات کی نشو ونما ہوسکتی ہے۔ملت کے مسائل مشکلات سے قوم کو روشناس کرایا جاسکتا ہے۔وطن اور قوم کی خدمت کا جذبہ دلوں میں بیدار کیا جاسکتا ہے۔اسلامی تعلیم اور اسلامی تاریخ کو عام کیا جاسکتا ہے اور مسلمانوں کے روشن کارناموں سے فرزندانِ اسلام کو باخبر کرکے ان کی غیرت وحمیت کو للکارا بھی جاسکتا ہے۔غرض شاعری دوسروں کو متاثر کرنے کا ایک بہترین ذریعہ ہے۔اسی لیے جو خیال اس کے ذریعے سے ادا کیا جاتا ہے، دلوں میں اتر جاتا ہے اور جذبات کو برانگیختہ کرتا ہے۔اس بنا پر اگر شاعری کے ذریعے سے اخلاقی مضامین بیان کیے جائیں اور شجاعت و ہمت، غیرت وحمیت اور آزادی وحریت جیسے شریفانہ جذبات کو مہمیز لگا کر اُنھیں ابھارا جائے تو میں سمجھتا ہوں کہ یہی شاعری کا بہترین مصرف ہے اور ایسی ہی شاعری شاعری کہلانے کی مستحق ہے، جس کے بارے میں حضرت فرید الدین عطار نے کہا ہے:

''شاعری جزویست از پیغمبری''۔

اردو کے نامور ادیب وشاعر علامہ شبلی نعمانی نے اپنی شاعری سے یہی کام لیا۔انھوں نے اپنی نظموں میں ملت کی دردمندی کا تذکرہ اچھوتے اسلوب اور دل نشیں انداز میں کیا اور مسلمانوں میں غیرت وحمیت، خودداری وحوصلہ مندی اور آزادی وبلند ہمتی کی تڑپ پیدا کی۔مولانا شبلی نعمانی کی شخصیت ہشت پہل اور جامعِ کمالات شخصیت تھی۔وہ بیک وقت ادیب بھی تھے اور ادیب گر بھی،مورخ بھی تھے اور سیرت نگار بھی، خطیب بھی تھے اور تنقید نگار بھی، متکلم بھی تھے اور فلسفی بھی۔ان تمام امتیازات وخصوصیات کے علاوہ شبلی اردو وفارسی کے قادرالکلام شاعر بھی تھے۔ان کی انھی خوبیوں کی بنا پر اقبال سہیل نے کہا تھا:

جمع در یک پیکرِ شبلی جہانے بودہ است
یوسفِ گم گشتہ را یک کاروانے بودہ است

ایک محتاط اندازے کے مطابق شبلی نے کم وبیش پانچ ہزار اشعار کہے ہیں اور تقریباً تمام اصنافِ سخن میں طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے یہاں غزلیات، قصائد، مثنویات، مراثی، مسدس، ترکیب بند، قطعات اور جدید منظومات سبھی کے نمونے موجود ہیں۔ البتہ انھوں نے اپنی نظموں کے ذریعے سے جس دل سوزی وجگر کاوی کے ساتھ مسلمانوں کے دورِ زوال کی داستان سنائی ہے اور انھیں عظمتِ رفتہ اور بہارِ گزشتہ کی باز آفرینی کی دعوت دی ہے، وہ انھی کا حصہ ہے اور شعروادب کی تاریخ کا ایک یادگار اور ناقابلِ فراموش باب ہے۔ مولانا شبلی کی یہ نظمیں زبان کی فصاحت، معنی کی بلاغت اور طرزِ ادا کی خوبی میں ممتاز ہیں۔ ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی لکھتے ہیں:

''ان کا (یعنی شبلی) کا اہم کارنامہ یہ ہے کہ انہوں نے اردو زبان کو علمی وتحقیقی تصانیف کا سرمایہ دار بنادیا۔......انہوں نے ادب کے تمام مختلف النوع میدانوں میں اپنے اشہب قلم کی جولانی دکھائی ہے۔ ان کا سرمایۂ شاعری بیشتر سیاسی وقومی نظموں پر مشتمل ہے۔''

(ڈاکٹر محمد نعیم صدیقی ندوی- علامہ سید سلیمان ندوی ...... شخصیت وادبی خدمات ص ۵۸-۵۹)

حالؔی نے مسدسِ حالی لکھی اور شبلی نے مسدسِ قومی اور مثنوی صبحِ امید۔ اس میں انہوں نے ملتِ اسلامیہ کے عروج وزوال کی داستان اتنے دردانگیز اور مؤثر اسلوب میں بیان کی ہے کہ ایک ایک لفظ تیر کی طرح دل میں پیوست ہوجاتا ہے اور پڑھنے والا اور سننے والا کسی اور عالم میں پہنچ جاتا ہے۔ شبلی ملت کے مرثیہ خواں بھی ہیں اور حدی خواں بھی۔ وہ ملت کی کشتی کو گرداب سے نکالنے اور ساحلِ مراد تک پہنچانے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں۔

ڈاکٹر ضیاء الدین انصاری کی نظر میں مولانا شبلی مذہبی عالم ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست کے نباض، راسخ العقیدہ مسلمان اور سرسید کی تعلیمی اور اصلاحی تحریک کے حامی اور علم بردار بھی تھے۔ ان کے سینے میں ایک پُرعزم اور پُرجوش مسلمان کا دھڑکتا ہوا احساس دل بھی تھا اور مسلم قوم کی زبوں حالی پر فکر مند ذہن بھی۔

(خلیق انجم- شبلی کی علمی وادبی خدمات ص ۱۵۷)

مرزا احسان بیگ کے نزدیک شبلی کی سیاسی اور تاریخی نظمیں اردو شاعری کے سرمایۂ سخن میں ایک قابلِ قدر اضافہ ہیں، جس کو اردو لٹریچر کا کوئی مؤرخ آسانی کے ساتھ نظر انداز نہیں کرسکتا''۔ (عبداللطیف اعظمی- مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں- ص ۲۰۴)

شبلی اگرچہ مورخ ہیں، نقاد ہیں، سیرت نگار ہیں، مگر بنیادی طور پر ان کا مزاج شاعرانہ ہے۔ بقول خلیل الرحمٰن اعظمی ''شعر سے لطف اندوزی ان کے یہاں ایک تخلیقی عمل بن گئی ہے''۔ (پروفیسر صغیر افراہیم- مقدمہ شبلی نعمانی بحیثیت شاعر مؤلفہ ڈاکٹر شبنم اکبر صفحہ ۱۰)

ڈاکٹر شبنم اکبر علامہ شبلی نعمانی کی شاعری کا تنقیدی

جائزہ لیتے ہوئے لکھتی ہیں:

''جہاں تک شبلی کی شاعری اور اس کی ادبی و فنی قدر و قیمت کا سوال ہے تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی کے بعد اردو میں قومی شاعری کو حقیقی جذبات اور شور انگیز طرزِ ادا، فارسی کی نغمگیت اور لطافت سے روشناس کرانے کا سہرا شبلی کے سر ہی جاتا ہے۔ مذہبی اور اخلاقی شاعری کے سلسلے میں بھی ان کا مقام بڑا ہی بلند ہے۔ اسلوب کی رنگینی، بحر اور وزن کی ترنم آفرینی، ردیف اور قافیے کی شگفتگی یہ سبھی ان کی شاعری کے نمایاں اوصاف ہیں، جن کی بدولت ان کی شاعری شادابی اور جاذبیت سے لبریز ہوئی۔

پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں:

''شبلی نے ہمارے علم میں گہرائی اور ادب میں تازگی پیدا کی ہے۔.........شبلی اگر نہ ہوتے تو محمد علی اور علامہ اقبال کہاں ہوتے''۔

(تنقیدی اشارے، بحوالہ شبلی نعمانی بحیثیت شاعر ص ۱۰۷-۱۰۸ ڈاکٹر شبنم اکبر)

ایڈیٹر الناظر مولانا ظفر الملک کا کہنا ہے کہ ''اگر شبلی اپنی تمام قابلیتوں کے ساتھ اردو شاعری اور صرف شاعری کے لیے وقف ہو جاتے تو وہ حالی سے بہت آگے نکل جاتے۔ ان میں ایک شاعر کی تمام قابلیتیں قدرت کی طرف سے ودیعت تھیں۔ اگر یہ دوسرے فردوسی نہیں تو پہلے اقبال ضرور ثابت ہوتے''۔

(عبد اللطیف اعظمی - مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں-ص ۲۰۳)

شبلی نے جس زمانے میں قومی اور سیاسی شاعری شروع کی، وہ زمانہ ہندوستان کے اندر اور باہر مسلمانوں کے لیے سخت آزمائش اور ابتلا کا دور تھا۔ اس دور میں تقسیمِ بنگال کی تنسیخ، مسجدِ کانپور کا ہنگامہ، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے قیام کا مسئلہ، مسلم لیگ کے نئے سیاسی عزائم اور بعض دوسرے مسائل مسلمانوں کے سامنے سینہ تانے کھڑے تھے۔ ان مسلم مسائل سے کوئی ذی شعور مسلمان چشم پوشی نہیں کرسکتا تھا۔ شبلی بھی خود کو اس سے الگ نہ رکھ سکے اور ایک شاعر اور ادیب کی حیثیت سے ان مسائل سے ہمیشہ نبرد آزما رہے۔ ان کی شاعری نے ان مسائل کی اہمیت کو عام لوگوں میں اجاگر کرنے کے لیے قابلِ ذکر کام کیا۔ ابوالفیض سحر لکھتے ہیں:

''شبلی کی شخصیت کا ایک اور پہلو یہ ہے کہ ہندستانی مسلمان اور عالمِ اسلام جب بھی ظلم و زیادتی، مصائب اور حادثات کا شکار ہوتے تھے، ان کے درد کی آواز شبلی کی تخلیقات اور نگارشات میں سنائی دیتی تھی۔''

(خلیق انجم-شبلی کی علمی و ادبی خدمات ص ۱۹۴-۱۹۵)

اس کی وجہ یہ ہے کہ مولانا شبلی کو ملکی اور عالمی مسائل سے گہری دلچسپی تھی، ملک و قوم خصوصاً مسلمانوں کی ترقی کے لیے وہ اپنے کو بالکل وقف کر دیتے تھے۔ مسلمانانِ ہند یا

مسلمانانِ عالم کے ساتھ کوئی بھی حادثہ یا واقعہ پیش آتا ، اس پروہ بے باکانہ طور پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ،نظمیں اور مضامین لکھتے اور عام مسلمانوں کو اس سے باخبر کرکے ان کے اندر بھی اس کا احساس جگانے کی کوشش کرتے تھے۔

شبلی کا سیاسی تصور نہایت ہی بالیدہ تھا۔علما میں وہ پہلے عالم تھے جنھوں نے اپنے وقت کے قومی و ملی مسائل سے حقیقی دلچسپی لی اور اس سے نبرد آزمائی کے لیے کانگریس کی حمایت کی، ہندمسلم اتحاد پر زور دیا۔اوقافِ اسلامی، جمعے کی چھٹی اور بہت سے ملی مسائل پر بحث کا آغاز کیا اور ان مسائل کو حکومتِ ہند کے سامنے پیش کرنے کی جرأت کی۔ان کو اسلام، اسلامی تمدن،اسلامی تحریک،اسلامی علوم وفنون سے جو ذہنی لگاؤ تھا،اس کو مٹتا دیکھ کر انہیں تکلیف ہوتی تھی۔وہ اپنے تصور کے اس چمن کو ہمیشہ کھلا دیکھنا چاہتے تھے،اس کے لیے وہ تمام عمر کوشش کرتے رہے۔

(تنقید کیا ہے ص ۳۹ آل احمد سرور بحوالہ شبلی نعمانی بحیثیت شاعر مؤلفہ ڈاکٹر شبنم اکبر صفحہ ۵۴-۵۵)

علامہ شبلی نے اپنے زمانے کی سیاست پر بھی مختلف نظموں میں اظہارِ خیال کیا ہے،جس میں ان کا اسلوب بہت ہی دلکش اور رنگین وپُراثر ہے۔شبلی کی اس قبیل کی نظموں پر تبصرہ کرتے ہوئے پروفیسر آل احمد سرور کہتے ہیں:

"شبلی نے اس زمانے کی سیاست پر اپنی نظموں میں اظہارِخیال کیا ہے اور باوجود اس کے کہ ان نظموں کے بہت سے موضوع وقتی ہیں،مگر شبلی کا رنگین اسلوب، دلکش اشارے، پُرزور لہجے اور ترنمِ زبان کی وجہ سے یہ نظمیں اب بھی مزہ دیتی ہیں۔"

(تنقیدی اشارے ص ۲۱۶ آل احمد سرور بحوالہ شبلی نعمانی بحیثیت شاعر ص ۱۰۱ ڈاکٹر شبنم اکبر)

سجاد ظہیر کہتے ہیں:

"ان کی (یعنی شبلی) کی سیاسی نظموں نے مسلمانوں کے سوئے جذبات کو جگادیا،جن پر پست ہمتی اور احساسِ کمتری کی چادریں پڑی ہوئی تھیں۔کانپور کے سانحے پر ان کی مختصر نظم "ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں" ایسی مؤثر ثابت ہوئی کہ حکومت کو ضبط کرنی پڑی، اور کیا "چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک" والی نظم کا مسلمانوں کی تاریخ میں ہمیشہ کے لیے ایک درخشاں مقام نہیں ہے؟"۔

(خطبۂ صدارت آل انڈیا اردو کانگریس منعقدہ حیدر آباد، جولائی ۱۹۴۴ء بحوالہ مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں- عبد اللطیف اعظمی ص ۱۵۳-۱۵۴)

"شبلی نے جس جرأت و ہمت سے سامراج پر چوٹیں کیں، شہنشاہیت کے خلاف نظمیں لکھیں، غیرملکی اقتدار کی جڑوں پر کلہاڑے لگائے،مسلمان عوام کو آزادی کی راہ پر گامزن ہونے کی تلقین کی، علما کو حجروں سے نکلنے کی دعوت دی اور قوم

پرست مسلمانوں کی رہنمائی اور قیادت کی، اس کی مثال نہ صرف ان کے ہم عصروں میں ناپید ہے، بلکہ عرصے تک اس کا وجود نظرنہیں آتا''۔

(عبداللطیف اعظمی-مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں ص ۱۵۴)

''شبلی نے ایک ہندوستانی کی حیثیت سے اگر ایک طرف اپنی نظموں کے ذریعے سے ہندستان کی تحریکِ آزادی کو تقویت پہنچائی تو دوسری طرف ایک مسلمان کی حیثیت سے عالمِ اسلام کی خدمت اپنی زندگی کا مطمحِ نظر قرار دیا اور بقول سید سلیمان صاحب ندوی'' بتیس برس (۱۸۸۲-۱۹۱۴) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم، اور اپنی نواسنجیوں سے پُرشور رکھا۔''

(عبداللطیف اعظمی -مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں ص ۱۶۳-۱۶۴)

مولانا شبلی کی ایک مثنوی ''صبحِ امید'' کے نام سے ہے، جس میں قومی ترقی وتنزل کا عبرت انگیز منظر بیان کیا گیا ہے۔ اردو ادب میں مثنوی اب تک قصے کہانیوں کے لیے وقف تھی، مولانا وہ پہلے شخص ہیں جنھوں نے اس کو قومی مقصد کے لیے استعمال کیا۔ اس مثنوی میں لفظ فصیح، معنی بلند، ترکیبیں دل پذیر، تشبیہ اور استعارے نازک، حشو وزوائد سے پاک اور بیان پُراثر ہے، اور یہی چیزیں مثنوی کی جان ہوتی ہیں۔ مثنوی کے شروع کے چند اشعار آپ کی خدمت میں پیش کرنے کو جی چاہتا ہے، ملاحظہ ہو:

کیا یاد نہیں ہمیں وہ ایام؟
جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کہ جان تھی جہاں کی
وہ تاج تھی فرقِ آسماں کی
گل کردیئے تھے چراغ جس نے
قیصر کو دیئے تھے داغ جس نے
وہ نیزۂ خوں فشاں کہ چل کر
ٹھہرا تھا فرانس کے جگر پر
روما کے دھنویں اڑا دیئے تھے
اٹلی کو کنویں جھنکا دیئے تھے

(کلیاتِ شبلی، اردو ص ۱۱)

مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا شبلی کی اردو شاعری کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے۔ ان میں چوتھا اور آخری دور ۱۹۰۸ء سے شروع ہوکر ۱۹۱۴ء تک یعنی ان کی وفات تک قائم رہا۔ اس دور میں عالمِ اسلام میں متعدد اہم حادثات و انقلابات رونما ہوئے اور مولانا شبلی نے ان سے متاثر ہوکر بہت ہی پُرسوز اور اثر انگیز نظمیں کہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ان کی اردو شاعری کا یہی دور ان کی اردو شاعری کا امتیازی دور ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی دنیا میں انقلاب برپا تھا۔ مسلم لیگ کا ہنگامہ، مسلم یونیورسٹی کا

قیام اور اس کے بعض حقوق کے لیے گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان شدید اختلاف، کانپور کی مسجد کا خونیں منظر، بنگال کی تنسیخ، طرابلس کی لڑائی، بلقان کی جنگ، ندوہ کے طلبہ کی وہ اسٹرائک جس نے پورے ہندوستان میں شورش پھیلادی تھی، اور آخر میں دنیا کی بڑی لڑائی۔''

(کلیاتِ شبلی، اردو ص ۱۷)

اس دور میں شبلی نے قومی اور بین الاقوامی حوادث و محرکات سے متاثر ہوکر قلب وضمیر کو جھنجھوڑنے والی متعدد نظمیں کہیں۔ ہر ہفتے جو واقعہ پیش آتا، اس پر وہ اس طرح اشعار میں اظہارِ خیال کرتے تھے کہ اس زمانے کے بچے بچے کی زبان پر وہ اشعار چڑھ جاتے تھے۔ ان نظموں میں جوشِ بیان، قوتِ نظر اور مؤثر طنز کا ایسا تیز نشتر چھپا ہوتا تھا کہ وہ جس پر پڑتا، تلملا جاتا تھا۔

شہر آشوبِ اسلام

یعنی جنگِ طرابلس و بلقان

۱۹۱۱ء میں تقسیمِ بنگال سے مسلمان غیر معمولی طور پر مضطرب اور پریشان تھے، کہ ان ہی ایام میں جنگِ بلقان کے چھڑنے سے ان کا رہا سہا سکون بھی جاتا رہا اور اس نے جلتی آگ پر تیل کا کام کیا۔ شبلی نے ان حالات سے متاثر ہوکر ''شہر آشوبِ اسلام'' کے عنوان سے ایک نہایت پُر اثر اور درد انگیز نظم لکھی، جس کا ایک ایک شعر پڑھنے کے قابل ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں کہ مولانا کی سیاسی نظموں میں سب سے پہلے قابلِ ذکر وہ نظم ہے جو ''شہر آشوبِ اسلام'' کے نام سے جنگِ بلقان کے زمانے میں لکھی۔ یہ نظم رفاہِ عام کلب لکھنؤ کے جلسے میں پڑھی گئی تھی، اور جب پڑھی گئی تھی تو اس کا یہ اثر تھا کہ صدر سے لیکر پائیں تک ماتم برپا ہوگیا تھا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشاں کب تک
چراغِ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کردیے پرزے
فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراقش جاچکا، فارس گیا، اب دیکھنا یہ ہے
کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریضِ سخت جاں کب تک
ہاں یہ سیلابِ بلا بلقان سے جو بڑھتا آتا ہے
اسے روکے گا مظلوموں کی آہوں کا دھواں کب تک

اس نظم کے ہر ہر لفظ میں درد وغم، حزن و یاس اور حسرت وناکامی کا سمندر موجیں مارتا نظر آتا ہے۔ یہ نظم شبلی نے لکھنؤ کے ایک جلسے میں نہایت پُر درد آواز میں پڑھی تھی، اور بقول ان کے شاگردِ رشید سید سلیمان ندوی: ''خود بھی روئے اور دوسروں کو بھی رلایا۔ معلوم ہوتا تھا کہ یہ بھی لکھنؤ کی کوئی ماتمی مجلس ہو۔'' (مولانا سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی ص ۴۵۹)

دراصل شبلی کو ہر لمحہ یہ فکر ستاتی ہے کہ مسلمان تمام دنیا میں ذلیل وخوار اور رسوا ہورہے ہیں۔ ہر مقام پر انہیں ہزیمت اور پسپائی کا سامنا ہے۔ صلیبی قوتیں ان پر حاوی ہوتی جارہی ہیں۔ ان کے علاقے چھنتے جارہے ہیں۔ خدام حرمین پر حیات وزندگی تنگ ہورہی ہے۔ ان حالات میں حرمین شریفین اور دیگر

مقدس مقامات کی حفاظت کا کام کون سرانجام دے گا۔ اسی نظم میں شبلی آگے چل کر ظالم یوروپی اقوام سے خطاب کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کوئی پوچھے کہ اے تہذیبِ انسانی کے استادو!
یہ ظلم آرائیاں تاکے؟ یہ حشر انگیزیاں کب تک؟
یہ مانا تم کو تلواروں کی تیزی آزمانی ہے
ہماری گردنوں پر ہوگا اس کا امتحاں کب تک
یہ مانا گرمیِ محفل کے ساماں چاہئیں تم کو
دکھائیں ہم تمہیں ہنگامۂ آہ و فغاں کب تک
یہ مانا قصۂ غم سے تمہارا جی بہلتا ہے
سنائیں تم کو اپنے دردِ دل کی داستاں کب تک
یہ مانا تم کو شکوہ ہے فلک سے خشک سالی کا
ہم اپنے خون سے سینچیں تمہاری کھیتیاں کب تک
کہاں تک لوگے ہم سے انتقامِ فتحِ ایوبی
دکھاؤگے ہمیں جنگِ صلیبی کا سماں کب تک
سمجھ کر یہ کہ دھندلے سے نشانِ رفتگاں ہم ہیں
مٹاؤگے ہمارا اس طرح نام و نشاں کب تک

اس سے آگے کے اشعار میں مسلمانوں کو غیرت دلاتے ہیں اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ ترکی کی شکست پوری ملتِ اسلامیہ کے زوال کا آغاز ہے۔ کفر والحاد نے اپنے آہنی پنجے پھیلا دیئے ہیں، اور اب ان کی نظریں مسلمانوں کے مقدس مقامات پر لگی ہوئی ہیں، اگر ان حالات میں بھی مسلمان خوابِ غفلت سے بیدار نہ ہوئے تو وہ دن دور نہیں جب ان کے مقدس مقامات بھی ان سے چھین لیے جائیں، اور یہ بس ہاتھ ملتے رہ جائیں۔ دیکھئے یہ اشعار:

زوالِ دولتِ عثماں زوالِ شرع و ملت ہے
عزیزو! فکرِ فرزند و عیال و خانماں کب تک
خدا را تم یہ سمجھے بھی کہ یہ تیاریاں کیا ہیں؟
نہ سمجھے اب تو پھر سمجھوگے تم یہ چیستاں کب تک

☆☆☆

پرستارانِ خاکِ کعبہ دنیا سے اگر اٹھے
تو پھر یہ احترامِ سجدہ گاہِ قدسیاں کب تک
جو گونج اٹھے گا عالم شورِ ناقوسِ کلیسا سے
تو پھر یہ نغمۂ توحید وگل بانگ اذاں کب تک
بکھرتے جاتے ہیں شیرازۂ اوراقِ اسلامی
چلیں گی تند، بادِ کفر کی یہ آندھیاں کب تک
کہیں اڑکر نہ دامانِ حرم کو بھی یہ چھو آئیں
غبارِ کفر کی یہ بے محابا شوخیاں کب تک
حرم کی سمت بھی صید افگنوں کی جب نگاہیں ہیں
تو پھر سمجھو کہ مرغانِ حرم کے آشیاں کب تک

عالمِ اسلام کے حالات سے شبلی کس قدر دل برداشتہ تھے، ان کے اس شعر سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے:

جو ہجرت کرکے بھی جائیں تو شبلی اب کہاں جائیں
کہ اب امن و امانِ شام ونجد و قیرواں کب تک

(مولانا سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی ص ۴۵۸-۴۵۹)

خیر مقدم ڈاکٹر انصاری

مولانا شبلی ترکی کو اسلامی مملکت کی شان وشکوہ کا نمائندہ سمجھتے تھے۔ ان کی جوانی کے دنوں میں ۱۸۸۶ء میں

روس و روم کی جنگ شروع ہوئی تو تمام دنیا کے مسلمانوں کی طرح شبلی نے بھی اس جنگ کی کھلم کھلا حمایت کی۔ یہ اس دور کی بات ہے جب برٹش حکومت میں ترکوں کا نام لینا بھی گناہِ عظیم تھا، لیکن شبلی ترکی کی حمایت میں ڈٹے رہے۔ انہوں نے ترکوں کی حمایت میں جلسے کیے۔ ہندستانی مسلمانوں سے چندے اکٹھے کیے اور ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی سربراہی میں ایک طبی وفد بھی ترکی بھیجا۔ جب یہ وفد ترکی سے واپس آیا تو آپ نے اس وفد کو بمبئی میں ایک شاندار استقبالیہ دیا اور طویل و پُرسوز نظم پڑھی، ایک تو درد بھری نظم، پھر علامہ کے پڑھنے کا پُرسوز انداز۔ ہزاروں کے مجمع پر وجد کا عالم طاری ہو گیا اور کوئی آنکھ ایسی نہ تھی جس میں آنسوؤں کے موتی نہ چھلک رہے ہوں۔

چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ادا کرتے ہیں ہم شکرِ جنابِ حضرتِ باری
کہ آئے خیریت سے ممبرانِ وفدِ انصاری
ہزاروں کوس جا کر بھائیوں کی تم نے خدمت کی
یہی تھا دردِ اسلامی، یہی تھی رسمِ غم خواری
تمہارے ناز اٹھائے اہلِ ملت جس قدر، کم ہے
کہ تم نے غازیانِ دیں کی، کی ہے ناز برداری
تمہارے سامنے موتی کی لڑیاں پوت سے کم ہیں
کہ دیکھ آئے ہو تم ترکی یتیموں کی گہر باری
تمہیں کچھ جان نوازی ہائے اسلامی کو سمجھو گے
کہ تم دیکھ آئے ہو نصرانیوں کی طرزِ خوں خواری

(ڈاکٹر شبنم اکبر: شبلی نعمانی بحیثیت شاعر صفحہ ۵۵-۵۶) اور خلیق انجم: شبلی کی علمی و ادبی خدمات ص ۱۷۶)

ہنگامۂ مسجدِ کانپور

بیسویں صدی کی دوسری دہائی کا ایک مشہور واقعہ اور ہندی مسلمانوں کے مذہبی جوش و خروش کے طوفان کا سب سے بڑا خونیں منظر وہ واقعہ ہے، جس نے برِصغیر کے مسلمانوں کو جھنجھوڑ کر رکھ دیا تھا، جو عین اس وقت رونما ہوا جب جنگِ بلقان کی آگ ایک طرف ہندوستان سے ہزاروں میل دور روشن تھی، اور مسلمانوں کے دل برطانیہ کی وزارتِ خارجہ کی سیاسی روش سے سخت مشتعل تھے اور دلوں کا بخار نکلنے نہیں پایا تھا کہ اچانک ۳۱/اگست ۱۹۱۳ء کو مچھلی بازار کانپور میں یہ واقعہ پیش آیا۔ جہاں ایک سڑک کی تعمیر و توسیع کے لیے ایک مسجد کا باہری حصہ ضلع مجسٹریٹ کے حکم پر شہید کر دیا گیا، اس واقعے سے تمام مسلمانوں میں غم و غصے کی لہر دوڑ گئی۔ مسلمانوں نے ایک عظیم الشان جلسہ کیا اور اس کے بعد جوش سے بھرے مسلمانوں نے اس شہید کیے گیے مسجد کے حصے کو دوبارہ تعمیر کروانا شروع کیا، یہ بات انتظامیہ کو ناگوار گزری، اور ڈپٹی کمشنر آف پولیس مسٹر بٹلر کے حکم پر انگریزی فوجوں نے نہتے مسلمانوں کو بھون ڈالا جس میں مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد شہید اور زخمی ہوئی، یہی نہیں، بلکہ امن و امان کے درہم برہم کرنے کے جرم میں گرفتار بھی کر لیا گیا اور ان پر مقدمے بھی چلائے گیے۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نے بڑا ہی اہم کردار ادا کیا اور وہ گوشۂ تنہائی کو خیر باد کہہ کے میدانِ عمل میں کود پڑے۔ احتجاجی جلسوں میں شرکت کی، پُرجوش تقریریں کیں اور رگوں میں منجمد خون کو پگھلا دینے والی متعدد نظمیں کہیں۔ یہ نظمیں اس قدر مؤثر تھیں کہ جس ہفتے وہ

الہلال کلکتہ یا ہمدرد دہلی یا زمیندار لاہور میں چھپتیں، ہندوستان کے اِس سرے سے اُس سرے تک اسلامی جوش وخروش کے رجز کا کام دیتی تھیں۔اس سلسلے کی ان کی پہلی نظم ''ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے
دیکھا قریب جاکے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفلِ خورد سال ہیں جو چپ ہیں خودمگر
بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لیے کہ بنائیں خدا کا گھر
نیند آگئی ہے ، منتظرِ نفخِ صور ہیں
کچھ نوجواں ہیں بے خبرِ نشۂ شباب
ظاہر میں گرچہ صاحبِ عقل و شعور ہیں
اٹھتا ہوا شباب یہ کہتا ہے بے دریغ
مجرم کوئی نہیں ہے، مگر ہم ضرور ہیں
سینے پہ ہم نے روک لیے برچھیوں کے وار
از بسکہ مستِ بادۂ ناز و غرور ہیں
ہم آپ اپنا کاٹ کے رکھ دیتے ہیں جو سر
لذت شناسِ ذوقِ دلِ ناصبور ہیں
کچھ پیرِ کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا
جو خاک وخوں میں بھی ہمہ تن غرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہوتم؟ آئی یہ صدا
ہم کشتگانِ معرکۂ کانپور ہیں

(مولانا سید سلیمان ندوی: حیاتِ شبلی ص ۴۶۶)......(ڈاکٹر شبنم اکبر۔شبلی نعمانی بحثیت شاعر صفحہ ۵۹-۶۰)

غرض مولانا کا پورا کلیات ایسی نظموں سے بھرا پڑا ہے جن میں یا تو ہندوستان کی غلامی پر رنج وغم کا اظہار اور استخلاصِ وطن کے لیے اہلِ وطن کو تحریض کی گئی ہے یا عالمِ اسلام کی زبوں حالی پر دل گداز نوحے ہیں،مگر ہمت شکنی اور یاس انگیزی کی ہوا تک لگنے نہیں دی ہے اور قوم کو اسلاف کے کارنامے یاد دلاکر نہایت حوصلہ افزا الفاظ میں رجز خوانی کی گئی ہے:

عجب کیا ہے کہ بیڑا غرق ہوکر پھر اچھل آئے
کہ ہم نے انقلابِ چرخِ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

(مولانا شبلی کا مرتبہ اردو ادب میں- عبداللطیف اعظمی ص ۱۷۸)

آخر میں ہم مولانا شبلی کے ہی اشعار پر اپنی بات ختم کرتے ہیں جوانھوں نے دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے طلبہ کو مخاطب کرتے ہوئے کہے تھے اور جو ''کلیاتِ شبلی اردو'' کے آخری صفحات میں ''طلبائے ندوہ سے خطاب'' کے عنوان کے تحت درج ہیں۔شاید مولانا مرحوم کے دل کی گہرائیوں سے نکلی ہوئی یہ صدا کسی مردِ خدا کے حق میں دعا بن کر قبول ہوہی جائے۔مولانا فرماتے ہیں:

کیے تھے ہم نے بھی کچھ کام، جو کچھ ہم سے بن آئے
یہ قصہ جب کا ہے ، باقی تھا جب عہدِ شباب اپنا
اوراب تو سچ یہ ہے، جو کچھ امیدیں ہیں، وہ تم سے ہیں
جواں ہو تم، لبِ بام آچکا ہے آفتاب اپنا

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

ادبِ اطفال میں قصوں اور کہانیوں کی اہمیت اور حکیم شرافت حسینؒ کی کاوشیں

سید ضیاء الحسن
سابق استاد ادبیاتِ اردو و فارسی
امیر الدولہ اسلامیہ کالج ،لکھنؤ

حکایت اور قصہ عربی الفاظ ہیں لیکن کہانی ہندی، ہندی والے کہتے ہیں کہ ہماری زبان کا مشہور لفظ ہے۔ معانی کے اعتبار سے تینوں ایک ہی ہیں، البتہ کبھی کبھی کسی وقوع پذیر حادثے یا واقعے کو کہانی کے انداز میں بھی پیش کیا جاتا ہے اور کبھی بے بنیاد فرضی قصہ گھڑ لیا جاتا ہے۔ قدیم زمانے میں سامع کی دل چسپی برقرار رکھنے کے لیے مافوق الفطرت جن، دیو، چڑیل، پریوں اور اڑن کھٹولہ وغیرہ کو کہانیوں میں شامل کرلیا جاتا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں آج کی طرح ریڈیو، ٹی وی اور سینما وغیرہ نہیں ہوتے تھے اور وقت گزاری کے لیے (بالخصوص رات میں) کوئی مشغلہ نہیں تھا، اس لیے اکثر صاحبِ حیثیت لوگ اپنے یہاں قصہ گو یا داستان گو حضرات کو ملازم رکھتے تھے، اور یہ اتنے ماہر ہوتے تھے کہ فی البدیہہ قصے اور کہانیاں گھڑ کر سنا دیتے تھے، لیکن بچوں کی سطح پر یہ کام گھر کی دادیاں اور نانیاں انجام دے لیتی تھیں۔

قصے اور کہانیوں کی ہمارے ادب میں بڑی اہمیت ہے۔ ماہرین تعلیم ونفسیات اس بات پر متفق ہیں کہ ابتدائی عمر میں بچوں کو جو بات بتلائی جاتی ہے وہ ان کے ذہن ودماغ میں بیٹھ جاتی ہے۔ اس لیے اس عمر میں انہیں آسان زبان میں اور کہانی کے روپ میں تربیت کے نقطۂ نظر سے اچھے اور نیک لوگوں کے واقعات سنائے جائیں۔ ہمت اور بہادری کی باتیں بتلائی جائیں۔ سچ بولنے کے فائدے، جھوٹ اور چوری کے نقصانات سے انہیں واقف کرایا جائے تو ان میں مستقبل میں اچھی صفات پیدا ہوں گی۔

بات زیادہ پرانی نہیں ہے۔ ابھی بہتوں کو یاد ہوگا کہ مہذب اور شریف گھرانوں کی بڑی بوڑھیاں بچوں کو ہوش سنبھالتے ہی چڑیا چڑے، راجہ رانی، شیخ چلی اور پریوں کی کہانیاں یا دیگر اخلاقی کہانیاں اور قصے سنانا شروع کردیتی تھیں۔ کبھی کبھی تو فرمائش کرکے بچے بڑے شوق اور توجہ سے سنتے اور اثر قبول کرتے تھے۔ یہ کہانیاں تحریری شکل میں موجود نہ تھیں۔ لیکن سینہ بہ سینہ منتقل ہوتی رہی ہیں۔ اور اب تو ان میں سے بہت سی کہانیاں بھلائی بھی جاچکی ہیں۔ الغرض یہی یا اس جیسی کہانیاں جب کوئی صاحبِ قلم صفحۂ قرطاس پر بکھیر دیتا ہے تو

وہ ادبِ اطفال میں شمار ہونے لگتی ہیں۔ ان کہانیوں کا بچوں پر یہ اثر ہوتا تھا کہ ان میں ابتدا سے ہی اچھائیوں سے رغبت اور برائیوں سے نفرت پیدا ہونے لگتی۔ پھر جب یہ بچے ذرا بڑے ہوجاتے اور پڑھنے لکھنے لگتے تو ایک طرف گلستاں و بوستاں کا درس شروع ہوجاتا تو دوسری طرف اخلاق محسنی، اخلاق ناصری، اخلاق جلالی، عزیز الأخلاق فی نصائح الآفاق اور دوسری بہت سی اخلاقی کتب پڑھائی جانے لگتیں۔ واضح رہے کہ ہندستان ایک طویل عرصے تک فارسی زبان وادب کا مرکز رہا ہے، مذکورہ کتب اسی عہد کی یادگار ہیں۔ بعض گھرانوں کے بزرگ باقاعدہ اخلاقی اور نصیحت آمیز کتابیں خود تحریر کر کے بڑے اہتمام سے بچوں کو پڑھاتے اور انہیں اخلاق، اچھے عادات واطوار اور اچھی تہذیب کا مالک بناتے کیونکہ اچھی تعلیم وتربیت کے بعد مستقبل میں انہیں بچوں کے ذریعے صالح معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

بچپن اور لڑکپن کی اس منزل تک پہنچتے پہنچتے ان بچوں میں ذوقِ مطالعہ جاگ اٹھتا ہے۔ اب وہ کچھ پڑھنا چاہتے تو اس وقت ماہرین کی تحریریں جو ادبِ اطفال میں شمار کی جاتی ہیں، والدین اور اساتذہ انہیں پڑھنے کو دیتے۔ اس طرح اخلاقی تعلیم وتربیت کا سلسلہ جاری رہتا تھا تا آنکہ وہ خود بالغ نظر و باشعور ہوجاتے اور ان میں خود بھلے برے کی تمیز پیدا ہوجاتی۔

موجودہ دور سائنس یعنی حقیقت پسندی کا دور ہے۔ آج بچے کا ذہن بالغ انسان کے ذہن سے زیادہ تیز کام کر رہا ہے۔ اس برق رفتار دنیا نے ٹی وی کے ذریعے بے مقصد، غیر اخلاقی اور سستے موضوعات کے پروگرام دے کر اسے نہ صرف بہلایا ہے بلکہ جدیدیت کے نام پر بچے سے اس کا بچپنا چھین لیا ہے۔ اب ان کو نہ تو بامقصد اصلاحی اور اخلاقی کتابیں نصیب ہیں اور نہ ہی نانیوں اور دادیوں سے پیار بھری اور نصیحت آمیز کہانیاں سننے کو ملتی ہیں۔ بس دن رات جنونیوں کی طرح ٹی وی کے سامنے بیٹھے رہتے ہیں۔ افسوس تو اس کا ہے کہ بے حیائی اور غیر اخلاقی پروگراموں سے متاثر ہوکر اکثر غلط عادتوں اور حرکتوں کے مرتکب ہوتے ہیں۔ ٹی وی کی مصروفیت نے ان سے مطالعہ کا شوق بھی چھین لیا ہے۔ اللہ ہم سب کو اور ہماری اولادوں کو اس نحوست سے محفوظ رکھے۔ آمین۔

بچوں کے لیے اب تک جن اہلِ قلم کی سنجیدہ کاوشیں خاص طور سے قابلِ ذکر ہیں، ان میں محمد حسین آزاد، علامہ ڈاکٹر سر محمد اقبال، اسماعیل میرٹھی، مائل خیرآبادی، ڈاکٹر ذاکر حسین، قدسیہ زیدی، حامد اللہ افسر، شفیع الدین نیر، افضل حسین، شان الحق حقی، مرتضی ساحل تسلیمی، پرواز رحمانی اور نثار عباسی وغیرہ کے نام سرفہرست ہیں۔

علاوہ ازیں بچوں کے ادب میں بچوں کے رسائل اور میگزینوں کا بھی اہم رول ہے۔ ملک کے کئی شہروں سے نکلنے والے درج ذیل رسائل کو نظرانداز نہیں کیا جاسکتا ہے، جیسے دہلی سے نکلنے والے رسائل میں پیامِ تعلیم، کھلونا اور امنگ۔ رامپور سے نور والحسنات۔ حیدرآباد سے فنکارِ نو۔ بنگلور سے صدائے اطفال۔ مالیگاؤں سے گلشنِ اطفال۔ لکھنؤ سے ٹافی اور کلیاں۔ اور بجنور سے غنچہ وغیرہ۔ مذکورہ رسائل میں سے چند

تو ابھی نکل رہے ہیں جب کہ کچھ اپنی بہارِ جانفزا دکھلا کر رخصت ہو چکے ہیں۔

مذکورہ بالا فہرست دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بچوں کے ادب پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن حقیقت اِس کے برخلاف ہے۔ ادبِ اطفال ہنوز تشنہ ہے۔ موجودہ وقت میں نئے لکھنے والے اس طرف توجہ نہیں دے رہے ہیں۔ اِس وقت ایسے تعمیری ادب کی شدید ضرورت ہے جس میں بچوں کی نفسیات کو ذہن میں رکھ کر ایسی سبق آموز کہانیاں، قصے، نظمیں اور معلوماتی مضامین تحریر کیے جائیں جن میں ان کے لیے کوئی پیغام ہو، جنہیں پڑھ کر ان کے اخلاق وکردار پر مثبت اثر پڑے۔

بچوں کا ادب بامقصد اور اصلاحی ہونا چاہئے۔ ان کے لیے لکھی گئی تحریریں آسان اور سلیس زبان میں ہوں، اندازِ بیان سلجھا ہوا، باعثِ کشش، پُراثر اور دل چسپ ہو۔ اس میں دی گئی مثالیں قابلِ قبول ہوں تاکہ بچے انہیں بآسانی سمجھ سکیں۔ واضح رہے کہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ترقی کے اس دور میں جن، بھوت، پری، چڑیل اور دیو مالائی کہانیاں بچوں کے حق میں مفید نہیں بلکہ مضر اور نقصان دہ ہیں، اس لیے ان سے احتراز کیا جائے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''ادبِ اطفال'' ہے کیا؟ شفیع الدین نیّر کے بقول: ''بچوں کے ادب سے مراد نظم ونثر کا وہ ذخیرہ ہے جو خاص طور سے بچوں کے لیے لکھا گیا ہو یا اپنی معنویت اور افادیت کے اعتبار سے بچوں کے لیے موزوں ہو، یا یوں سمجھئے کہ جو ادب چار پانچ سال کی عمر سے تیرہ چودہ سال کی عمر کے بچوں کے لیے مخصوص ہو، اسے ہم بچوں کے ادب سے تعبیر کر سکتے ہیں۔''

ادبِ اطفال کی اس تعریف کو دیکھتے ہوئے حکیم شرافت حسین رحیم آبادیؒ نے جو کچھ بھی لکھا ہے، یقیناً وہ مذکورہ عمر کے بچوں کے لیے ہی ہے اور خوب ہے۔ مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ تحریر فرماتے ہیں کہ:

> '' محبِّ مکرم نے بالکل چھوٹے بچوں اور بالغ مبتدیوں کے لیے بہت ہی آسان زبان میں ان واقعات (دینی واسلامی) کا خلاصہ بیان کر دیا ہے تاکہ تعلیم وتربیت کی ابتدائی منزل میں ہی یہ واقعات دلوں میں اس طرح جم جائیں کہ پھر زندگی کے آئندہ دور میں جو مشکلات ومصائب پیش آئیں ان کے مقابلے کی ہمت ہو، اور سخت ناموافق حالات میں بی اسلام کے پھیلانے کا حوصلہ ہو۔''

(از تعارف کتاب اچھی باتیں حصہ دوم)

حکیم شرافت حسین کے والد شیخ الطاف حسین ایک خوش حال زمین دار گھرانے کے چشم وچراغ تھے اور رحیم آباد میں قیام پذیر تھے۔ اس طرح حکیم صاحب کا آبائی وطن رحیم آباد ہوا۔ رحیم آباد لکھنؤ سے تقریباً ۳۵ کلومیٹر دور بجانب مغرب ملیح آباد کے آگے اور سندیلہ سے پہلے ایک چھوٹا سا صاف ستھرا قصبہ ہے، یہ نفاست پسند اور نازک مزاج تعلیم یافتہ شرفاء کا مرکز ہے، بالخصوص یہاں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور علی گڑھ

مسلم یونیورسٹی کے فارغین کی خاصی تعداد ہے۔ لکھنؤ کے مشہور ایڈوکیٹ شیخ اقبال علی، شیخ فیاض علی، شیخ مشتاق علی، ڈاکٹر ارشد ندوی (سابق پروفیسر پنجاب یونیورسٹی، پٹیالہ) مشہور خوش فکر شاعر اخگر مشتاق ندوی، احتشام علی ندوی (سابق منتظم ادارہ تعلیمات اسلام لکھنؤ) جمیل احمد ندوی اور بہت سے دیگر حضرات اسی خطے سے تعلق رکھتے تھے۔

شرافت حسین صاحب کی ابتدائی دینی اور اردو، فارسی وعربی کی تعلیم والدین ہی کی نگرانی میں گھر پر ہوئی، لیکن مطالعہ کی وسعت اور شوق کی بدولت علم میں گہرائی پیدا ہوگئی۔ چونکہ اس زمانے میں حکمت اور طبابت کا پیشہ بڑی اہمیت کا حامل تھا، اس لیے بزرگوں کے مشورے سے لکھنؤ کے مشہور زمانہ تکمیل الطب کالج میں داخل ہوکر حکمت کی تعلیم حاصل کی اور یہیں سے فن طب کی سند حاصل کی۔ اس طرح ''حکیم'' ان کے نام کا جزو بن گیا۔ اب وہ شرافت حسین نہیں، ''حکیم شرافت حسین رحیم آبادی'' مشہور ہوگیے۔ تاہم اس پیشے سے انہوں نے برائے نام ہی تعلق رکھا۔ چونکہ وہ لکھنے پڑھنے کے شوقین تھے، اس لیے زیادہ تر قلم و کاغذ سے ان کا رشتہ رہا۔ انہوں نے بہت سے مضامین تحریر کیے ہیں اور ایک کتاب ''گردشِ ایام'' کے نام سے بھی لکھی ہے۔

حکیم صاحب کے صاحبزادے محمد سلیمان صاحب تحریر کرتے ہیں کہ ''گردشِ ایام'' والد صاحب کی پہلی تصنیف ہے اور بڑی اہمیت والی کتاب ہے، جو انہوں نے ''سود'' پر لکھی تھی۔ یہ کتاب ایسی مؤثر ہے کہ پڑھنے کے دوران ہی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے ہیں اور سود کے لین دین سے نفرت پیدا ہوجاتی ہے۔'' (پیش لفظ ''گردشِ ایام'')

حکیم صاحب اب لکھنؤ منتقل ہوگیے تھے۔ وہ ندوہ کی پشت پر مشہور محلّہ مکارم نگر میں (بعض مصلحتوں کی بنا پر جس کا نام بدل کر اب بروليا ہوگیا ہے) پارک کے قریب ایک دو منزلہ مکان میں (جس میں آج کل مکتبۂ دین و دانش ہے) قیام پذیر تھے۔ ندوہ اور علمائے ندوہ سے انہیں قلبی تعلق تھا۔ حکیم صاحب کو میں نے اپنے بچپن میں خوب خوب دیکھا ہے اور بارہا ان کے دولت کدہ پر حاضری دی ہے۔ میرے والد مولانا نورالحسنؒ اس زمانے میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں استاد بھی تھے اور ''بڑی بورڈنگ''، یعنی شبلی ہاسٹل کے نگراں بھی۔ مکارم نگر چونکہ ندوہ کی پشت پر تھا اور بہت قریب۔ اس لیے حکیم صاحب جب ندوہ تشریف لاتے تو اپنے محلے سے محض چند قدم کے فاصلے پر پشتِ ندوہ کی چہار دیواری میں بنے ایک چھوٹے سے گیٹ سے یہاں آجاتے تھے۔ چونکہ بورڈنگ کا پہلا کمرہ (جو باقاعدہ رہائشی مکان تھا) والد صاحب کا تھا، اس لیے حکیم صاحب کی پہلی نشست یہیں ہوتی تھی، اور دیر تک دونوں کے مابین گفتگو کا سلسلہ جاری رہتا۔ آج بھی ان کا سراپا میری نظروں میں گھوم رہا ہے۔ ماشاءاللہ دراز قامت، چھریرا بدن، لمبی داڑھی، ترشی ہوئی مونچھیں، گندمی رنگ، آنکھوں سے ذہانت ٹپکتی ہوئی، شیروانی اور چوڑی مہری کے پاجامے میں ملبوس اور اکثر ہاتھ میں ایک خوبصورت چھڑی۔ تصور کی نگاہ سے دیکھئے تو ایسا لگتا ہے جیسے ع

وہ چل رہے ہیں، وہ پھر رہے ہیں، وہ آرہے ہیں، وہ جارہے ہیں

حکیم صاحب نے جس زمانے میں لکھنا شروع

کیا۔ اس وقت اہلِ علم وقلم سے (بالخصوص حضرت مولانا علی میاںؒ، مولانا منظور نعمانیؒ، مولانا عبد السلام قدوائیؒ اور مولانا عبد الماجد دریابادیؒ وغیرہ سے) ان کے اچھے روابط تھے۔

حضرت مولانا علی میاں تحریر فرماتے ہیں:

''راقم کو تقریباً ۱۹۳۰ء سے مولوی حکیم شرافت حسین صاحب سے نیاز حاصل ہے۔ میں بھی اس وقت طالب علم اور وہ بھی ہمارے استاذ ڈاکٹر شیخ تقی الدین ہلالی مراکشی سابق استاد دار العلوم ندوۃ العلماء کے پاس عربی پڑھنے آتے تھے۔ ہلالی صاحب ہی نے میرا ان سے تعارف کرایا، یہ ملاقات رفتہ رفتہ رفاقت اور علمی تعاون میں تبدیل ہوگئی، انہوں نے اس زمانہ میں ایک کتاب ''گردش ایام'' کے نام سے لکھی تھی، مجھے اس پر مقدمہ لکھنے کی عزت حاصل ہوئی، یہ کام ایسی نیک ساعت میں ہوا تھا کہ کتابوں پر مقدمہ لکھنے کی خدمت مستقل میرے سپرد ہوگئی اور اُس وقت سے اِس وقت تک اتنے مقدمے لکھے کہ اچھا خاصہ مقدمہ باز ہوگیا۔''

(پیش لفظ ''گردشِ ایام'')

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی ''گردشِ ایام'' کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''حکیم صاحب ایک کامیاب انشاء پرداز ہیں، مضمون نگاری ان کی زندگی کا ایک دلچسپ مشغلہ ہے، مختلف مضمونوں کے علاوہ ایک مستقل کتاب بھی تصنیف کی ہے، جس میں ان کے قلم نے گردشِ ایام کا ایسا عبرت انگیز مرقع کھینچا ہے کہ پڑھنے والوں کے دل غمگین اور آنکھیں اشک بار ہوگئیں، اور دیکھنے والوں کو حوادثِ روزگار کے ان تماشوں میں خود اپنا ہی تماشا نظر آیا۔''

(مقدمہ ''اللہ کے رسول'')

مولانا عبد السلام قدوائی ندوی مذکورہ مقدمہ میں مصری ادیب کامل کیلانی کی کتاب حکایات الاطفال (عربی) کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''جملوں میں تکرارِ لفظی بچوں کے لیے بہت مفید ہے۔ کامل کیلانی نے ہر لفظ کو اتنی مرتبہ دہرایا ہے کہ وہ بچے کے ذہن میں بالکل جم جاتا ہے۔ اس لیے عرصے سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ ایسی کتابیں لکھی جائیں جن میں الفاظ اور جملوں کی تکرار اور عبارتوں اور حکایتوں کی سہولت وآسانی کے ساتھ بچوں کی دینی واخلاقی تعلیم وتربیت کا بھی لحاظ رکھا جائے .... ضرورت تھی کہ اردو میں بھی اس قسم کی کتابیں مرتب ہوں تاکہ ابتدائی درجوں کے اردو خواں بچے بھی انہیں آسانی کے ساتھ پڑھ سکیں، کئی برس سے یہ خیال ذہن میں چکر لگا رہا تھا، اس سلسلے میں متعدد احباب سے گفتگو ہوئی، لیکن زبانی تائید کے سوا کسی نے عملی اقدام کی ہمت نہ کی۔ بالآخر ایک دن کرم فرمائے دیرینہ محبّ مخلص مولوی حکیم شرافت حسین رحیم آبادی سے باتیں ہو رہی تھیں، دورانِ گفتگو میں یہ ذکر بھی ہوا۔ حکیم صاحب تو سراپا عمل

ہیں،فوراًاس خیال کوعملی جامہ پہنانے کے لیے تیار ہوگیے ،اسی مجلس میں کام کا خاکہ بنا،عنوانات تجویز ہوئے اور ایک نقشۂ عمل مرتب ہوگیا، اور طے پایا کہ اس سلسلے کا آغاز اس ذاتِ قدسی صفات کے تذکرہ سے کیا جائے جو کائنات کا مقصود اور انسانیت کا منتہیٰ ہے۔''یعنی اللہ کے رسول''۔

پھر الحمدللہ'' اللہ کے رسول'' مکمل ہوئی۔صحابۂ کرام یعنی حضرت ابوبکرؓ،حضرت عمرؓ،حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ یکے بعد دیگرے منظرِ عام پر آئیں اور انہیں صفاتِ عالیہ کے ساتھ۔جس میں چھوٹے چھوٹے جملے تھے۔اسماء اور افعال کی تکرار تھی۔زبان آسان اور انتہائی سادہ تھی۔نتیجہ یہ ہوا کہ ان کتابوں کومقبولیت نصیب ہوئی۔

مذکورہ کتابوں میں سے کوئی ایک جب حضرت مولانا منظور نعمانی کی نظر سے گزری تو انہوں نے بھی ہمت افزائی کی،ملاحظہ ہو:

''خاکسار نے ان کے رسائل میں سے ایک رسالہ دیکھ کرایک دن ان سے درخواست کی کہ وہ ایسی ہی دلچسپ اور سبک و شیریں زبان میں بچوں ہی کے لیے دین کی بنیادی تعلیمات پر بھی ایسے ہی چھوٹے چھوٹے رسالے لکھیں۔چندروز کے بعد وہ یہ رسالہ (اچھی باتیں حصہ اول) تیار کرکے لے آئے ...... میرا خیال ہے کہ موصوف کا یہ رسالہ اپنی خصوصیات میں ان کے پہلے سب رسالوں پر فوقیت لے گیا ہے۔توحید،شرک، رسالت اور ضرورتِ وحی جیسے مسائل و مضامین کو اتنا دلچسپ اور آسان کر کے سمجھانا اور ان مہماتِ دین کے متعلق قرآنی دلائل و بینات کو اس قدر شیریں اور لذیذ بنا کے بچوں کے دلوں میں اتار دینا حکیم صاحب ہی کا خاص کمال ہے جو اللہ تعالیٰ نے انہیں نصیب فرمایا ہے''۔

(تعارف کتاب''اچھی باتیں حصہ اول)

دیکھتے ہی دیکھتے''اچھی باتیں'' کا سلسلہ اختتام کو پہنچا اور اس کتاب کے بھی چھ حصے مکمل ہوگیے۔اب حکیم صاحب کو اپنی کتابوں کی مقبولیت دیکھ کر ہمت بندھی اور مزید آگے کام بڑھانے کا حوصلہ ملا۔حکیم صاحب جانتے تھے کہ اس وقت بچوں کا جو ادب منظرِ عام پر آرہا ہے، وہ کاغذ کے پھولوں کی طرح خوش نما تو ہے لیکن خوش بو سے محروم۔ چمک بھڑک والا جسم تو ہے لیکن اندر سے کھوکھلا اور بے روح۔ یہ بے مقصد تخریبی ادب مغرب کی اندھی تقلید کی دین ہے،اسی لیے نقصان دہ اور مضر بھی۔اس وقت ایسے بامقصد ادب کی ضرورت ہے جو نونہالانِ وطن کو اچھی سوچ کا حامل بنا سکے جس میں خداترسی بھی ہو اور ملک وملت کی فلاح بھی، جو انسان کو انسان بنانے والا ہو نہ کہ حیوان ....جس وقت حکیم صاحب کی یہ خاموش علمی وادبی کاوشوں کا سلسلہ جاری ہوا، اس وقت اسماعیل میرٹھی کی ریڈریں بڑے شوق سے پڑھی جارہی تھیں،اور یہ حقیقت ہے کہ اب تک ان کے مقابل میں دوسری ریڈریں اپنا قدم نہ جما سکیں ۔تعجب کی بات ہے ....کہ کئی انجمنوں نے ،

دینی تعلیمی کونسل نے، کئی اردو سوسائٹیز کے علاوہ انفرادی طور پر بہت سے اردو داں حضرات نے بچوں کے لیے اردو کی نصابی کتابیں تحریر کیں اور اپنا سارا زورِ قلم صرف کر دیا لیکن اسماعیل میرٹھی کی ریڈروں کا مقابلہ نہ کر سکے

نہ ہوا پر نہ ہوا میر کا انداز نصیب
ذوق یاروں نے بہت زور غزل میں مارا

حضرت مولانا علی میاں ندویؒ بھی اسماعیل میرٹھی کی کتابوں کی اچھائی اور عمدگی کے معترف ہیں، فرماتے ہیں:

''میں نے جب اردو شروع کی تو اس وقت ہمارے صوبہ جات متحدہ آگرہ و اودھ میں مولوی محمد اسماعیل میرٹھی کی کتابیں سرکاری اسکولوں میں بھی نصاب میں داخل تھیں اور گھر گھر ان کا چلن تھا۔ یہ ۲۲-۱۹۲۱ء کا زمانہ تھا۔ اردو زبان کے ایک مؤرخ کے بقول: ''ہندستان کا سررشتۂ تعلیم بچوں کی اردو تعلیم و عام معلومات کے لیے اس سے بہتر نصاب نہیں لکھوا سکا''۔

(پیش لفظ از کتاب ''ہمارا ایمان'')

یہ وہ ماحول تھا جس میں ایک قسم کا چیلنج تھا کہ کسی بھی مصنف کی بچوں کے لیے لکھی جانے والی کتابیں کامیاب نہیں ہوں گی، لیکن حکیم صاحب نے ''چل مرے خامہ بسم اللہ'' کہہ کر اپنے اشہبِ قلم کو میدان میں اتار دیا اور یہی نہیں، انہوں نے ادبِ اطفال میں اسلامی تاریخی ادب پیش کر کے قابلِ قدر اضافہ کیا۔ حضرت مولانا فرماتے ہیں کہ:

''ضرورت تھی کہ اردو میں بھی اس سلسلے میں کام ہو اور اس میں تعلیم کے جدید تجربوں اور دوسرے ممالک کی محنتوں سے فائدہ اٹھایا جائے۔'' یہ حضرت مولانا کی دعا تھی جو مقبولِ بارگاہ ہوئی۔ یعنی (اے اللہ!) ''ان کے قلم سے تاریخ اسلام کی دوسری نامور ہستیوں اور مسلمانوں کے لیے قابلِ اقتداء اشخاص کی سیرت و سوانح کی تکمیل کرادے''۔ چنانچہ حضرات صحابۂ کرام کے بعد اچھی باتیں (چھ حصے) ازواجِ مطہرات میں حضرت خدیجہؓ، حضرت عائشہؓ، حضرت سودہؓ، اچھے قصے اور ہمارا ایمان جیسی دیگر کتب عالمِ وجود میں آ گئیں''۔..............

حضرت مولانا اللہ کا شکر ادا کرتے ہوئے آگے لکھتے ہیں:

''حکیم صاحب نے بچوں کے لیے اپنے دین سے واقفیت پیدا کرنے اور زبان و دین کو ساتھ ساتھ سکھانے کے لیے چھوٹی چھوٹی کتابوں کا جو اہم سلسلہ شروع کیا ہے، یہ اس کی آٹھویں کتاب ہے۔ اس سے پہلے رسولِ اکرم، آپ کے چاروں خلفاء کے حالات، پھر کلمہ طیبہ کی تشریح اور صحابۂ کرامؓ کی تکلیفوں اور آزمائشوں کے واقعات و حالات میں جو اللہ کے فضل و کرم سے بڑی مقبول ہوئیں اور

گھر گھر پھیل گئیں....‘‘

مولانا ’’اچھی باتیں حصہ سوم‘‘ جس میں بڑے ہی سائنٹیفک انداز میں نماز کی اہمیت بتلائی گئی اور تاکید کی گئی ہے، کی تعریف میں مزید لکھتے ہیں:

’’حکیم صاحب نے کتاب کا آغاز بڑے مناسب انداز سے کیا ہے۔ انہوں نے براہِ راست نماز کی حقیقت، فضیلت اور ضرورت بیان کرنے کے بجائے یہ دکھایا ہے کہ مومن کی زندگی کو عبادت کے سانچے میں ڈھل کر نکلنا چاہیے اور اس کی پوری زندگی میں عبادت کی روح جاری وساری ہونا چاہیے، لیکن اس پھیلی ہوئی اور ہاتھ سے پھسلنے والی غفلت سے بھری زندگی اور اپنے میں مشغول کر لینے والی دنیا میں اِس کی کیا صورت ہے؟ اور اس کی طاقت اور مشق کس طرح پیدا ہوسکتی ہے؟ انہوں نے بڑی خوبی سے ثابت کیا ہے کہ اس کا ذریعہ نماز ہے جو خدا کی طرف متوجہ کرنے اور اس کا دھیان رکھنے کی مشق پیدا کرنے کا تیر بہ ہدف نسخہ ہے، بشرطیکہ وہ خود توجہ اور دھیان کے ساتھ ہو۔ یہ ایک ایسا اہم مضمون اور حقیقت ہے جو اگر اس موضوع کی کسی بڑی تصنیف میں بیان ہوتی تو قابلِ ذکر اور قابلِ تحسین ہوتی، نہ کہ بچوں کی ایک ایسی کتاب میں!... یہ بھی ایک نہایت مناسب و موزوں بات ہے کہ ابتدائے عمر میں یہ حقیقت بچوں کے ذہن نشیں ہوجائے اور ان کی زندگی میں یہ بنیاد قائم ہوجائے جس پر دینی و ایمانی زندگی کی پوری عمارت قائم ہوتی ہے‘‘۔

(از تعارف کتاب ’’اچھی باتیں حصہ سوم‘‘)

سچ بات تو یہ ہے کہ یہ حکیم شرافت حسین رحیم آبادی کا کارنامہ ہے کہ انہوں نے ایسے چیلنجنگ پیریڈ میں بچوں کے لیے ایسی اسلامی، تاریخی اور ادبی کتابیں لکھ ڈالیں جن کے بارے میں امید نہ تھی کہ وہ اتنے شوق سے پڑھی جائیں گی اور انہیں اتنی مقبولیت نصیب ہوگی۔ کیونکہ ایک طرف عام مذہب بیزاری، دین سے بے توجہی اور بے رغبتی تھی تو دوسری طرف اس زمانے میں اردو میں لکھی جانے والی بچوں کی ریڈروں کی غیر مقبولیت۔ یقیناً اسے توفیقِ الٰہی کہنا چاہیے اور ان کے رفقاء اور علمی معاونین (میری مراد حضرت مولانا علی میاںؒ، مولانا منظور نعمانیؒ اور مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ) کی دعاؤں کا نتیجہ۔

ایں سعادت بزورِ باز نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆☆
☆☆☆☆☆

بچوں کے لیے حکیم شرافت حسین رحیم آبادیؒ کی پیاری کتاب

''حضرت عمر رضی اللہ عنہ''

ڈاکٹر غیاث الدین ندوی

راقم کی عمر مکتب نشینی کی ہوئی تو بجائے اس کے کہ اس کو کسی مکتب میں داخل کر کے رائج و شائع نصاب کی تعلیم دلائی جاتی، والدِ ماجد مولانا سید عبد الغفار ندوی نگرامی مجددی قدس سرہ العزیز نے اپنا ایک نیا طریقہ اختیار فرمایا۔ خوش قسمتی سے گورکھپور کے صاحبِ معرفت، ولی صفت بزرگ اور نامور ماہرِ تعلیم ماسٹر صبغت اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے تسمیہ خوانی کرائی۔ اس کے فوراً بعد والدِ مرحوم نے اپنی قلمی اردو ریڈر سے پڑھانا شروع کر دیا۔ یہ ریڈر انہوں نے خاص راقم کے لیے بہت سہل اور دل نشیں انداز میں ترتیب دی تھی، جس کی پہلی سطر میں '' آ ''، دوسری میں '' تو آ ''، اور بعد کی سطروں میں بتدریج جملوں کا سلسلہ دراز ہوتا چلا گیا تھا۔ ریڈر تمام ہوئی تو حکیم شرافت حسین رحیم آبادی کی کتابیں شروع ہوئیں، جو تمام کو پہونچیں۔ لکھنے کے لیے بالترتیب سینٹھے کے قلم سے تختی پر کلک اور ہولڈر پن سے کاغذ پر مشق کرائی گئی۔ اسی طرح اردو لکھنے پڑھنے کی شد بد کے ساتھ ہی دار العلوم ندوۃ العلماء کے نصاب کے مطابق درجہ اول عربی میں داخل کرایا گیا۔ مدرسے کے گھنٹوں کے بعد مختلف اوقات میں ناظرۂ قرآن، مولوی اسماعیل میرٹھی مرحوم کی اردو کی پہلی، دوسری، تیسری، چوتھی کتابیں پڑھانے کا نظام رہا، اور ساتھ ہی ریاضی کی مشق کرائی جاتی رہی، اور ہندی انگریزی کی ابتدائی تعلیم بھی جاری رہی، خارجی مطالعے کے طور پر بجنور سے شائع ہونے والا بچوں کا رسالہ ''غنچہ'' راقم کے نام جاری کرایا گیا۔ نظم میں حفیظ جالندھری مرحوم کا '' شاہنامۂ اسلام'' پڑھایا گیا۔

حکیم شرافت حسین کا اسلوبِ نگارش اتنا سادہ، پُر اثر، اور دلنشیں تھا کہ راقم کو پوری پوری کتاب یاد ہو گئی تھی۔ سیرت کے جلسوں میں اس خورد سال کو کھڑا کیا جاتا تو اپنی یاد سے انہی عبارتوں کو دہراتا اور ساتھ میں شاہنامے کے اشعار بھی پڑھتا اور شاباشی بھی پاتا تھا۔

حکیم صاحب مرحوم کی کتابوں کے واسطے سے دل میں ان سے خاصا لگاؤ پیدا ہو گیا اور حکیم صاحب کو دیکھنے اور ان سے ملنے کا شوق گھر کر گیا تھا، چنانچہ جب دار العلوم میں داخل ہوا تو حسبِ ضرورت جوشی ٹولہ، مکارم نگر کے راستے ڈالی گنج آنے جانے کا سلسلہ بھی شروع ہوا۔ آتے جاتے نماز کا وقت ہوتا تو مکارم نگر کی مسجد کا رخ کیا جاتا۔ یہاں کرتے، پائجامے، ٹوپی میں ملبوس منحنی بدن کے ایک بزرگ بیٹھے مل جاتے۔ معلوم ہوا کہ یہ بزرگ حکیم شرافت حسین صاحب ہیں۔ دھیرے

دھیرے پاس بیٹھنے کی ہمت کی۔ حکیم صاحب بڑی محبت سے پیش آتے اور باتیں کرتے۔ خاص طور پر اپنے تبلیغی اسفار کے قصے سناتے۔ اسی ضمن میں ایک بار بتایا کہ ان کی جماعت ایک ایسے گاؤں پہونچی تھی جہاں کوئی نمازِ جنازہ ادا کرنے والا نہ تھا۔ لوگ میت کو قبر میں رکھ کر ڈھیلے پھونک پھونک کر رکھ دیتے اور قبر بند کر دیتے۔ برسوں پہلے راقم کو بارہ بنکی کے ایک دور دراز گاؤں میں ایک جنازہ میں شرکت کا اتفاق ہوا جہاں نمازِ جنازہ تو ہوئی اور میت کو قبر میں اتارنے کے بعد ایک شخص نے صدا لگائی کہ ''قُل'' کے ڈھیلے لاؤ اور گاؤں کے لوگ دونوں ہاتھوں میں مٹی کے ڈھیلے لا کر دیتے گیے جو قبر میں رکھ دیئے گیے ، اس وقت حکیم صاحب مرحوم کی بات یاد آتی تھی۔

حکیم صاحب نے ''اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)'' نامی کتاب سے بچوں کے لیے سیرتِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) وسیرت خلفائے راشدین (رضی اللہ عنہم) کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ ''اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم)'' کے دیباچے میں معروف ماہرِ تعلیم ومحقق عالمِ دین، سابق ناظمِ دینیات جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور سابق معتمدِ تعلیم ندوۃ العلماء مولانا عبد السلام قدوائی ندوی رحمہ اللہ نے ۱۰/ربیع الثانی ۱۳۶۵ھ مطابق ۱۵/مارچ ۱۹۴۶ء کی تاریخ میں مشہور مصری ادیب کامل کیلانی کی کتاب "**حکایات الأطفال**" کی زبان وبیان اورشانِ ترتیب وکتابت کی خوبیاں بیان کرنے کے بعد تحریر فرمایا:

> '' لیکن ان خوبیوں کے باوجود اس مصری کتاب میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ عبارتی سہولتوں کے سوا اور کوئی معنوی مقصد مصنف کے پیشِ نظر نہیں ہے۔ حکایتیں اور کہانیاں اخلاقی اور دینی اسباق سے خالی ہیں بلکہ بعض بعض موقعوں پر بچوں کے دل و دماغ پر مضر اثرات پڑنے کا خطرہ ہے۔ اس لیے عرصے سے ضرورت محسوس ہو رہی تھی کہ ایسی کتابیں لکھی جائیں جن میں الفاظ اور جملوں کی تکرار اور عبارتوں اور حکایتوں کی سہولت و آسانی کے ساتھ بچوں کی دینی اور اخلاقی تعلیم و تربیت کا بھی لحاظ رکھا جائے۔ اس ضرورت کے پیشِ نظر گزشتہ سال محبّ مکرم مولوی سید ابوالحسن علی صاحب نے اپنی مشہور عربی کتاب "قصص النبیین" شائع کی جس میں الفاظ اور جملوں کی تکرار اور عبارتوں کی سادگی اور روانی کا اس طرح لحاظ رکھا گیا ہے جس طرح "**حکایات الأطفال**" کے مصنف کے پیشِ نظر ہے، لیکن فضول اور بے مقصد حکایتوں کے بجائے انبیاء علیہم السلام کے دلکش اور پُر اثر واقعات بیان کیے گیے ہیں۔ ضرورت تھی کہ اردو میں بھی اس قسم کی کتابیں مرتب ہوں تا کہ ابتدائی درجوں کے اردو خواں بچے بھی انہیں آسانی کے ساتھ پڑھ سکیں۔ کئی برس سے یہ خیال ذہن میں چکر لگا رہا تھا، اس سلسلے میں متعدد احباب سے گفتگو ہوئی لیکن زبانی تائید کے سوا کسی نے عملی اقدام کی ہمت نہ کی۔ بالآخر ایک دن کرم فرمائے

دیرینہ محبّ مخلص حکیم شرافت حسین رحیم آبادی سے باتیں ہورہی تھیں۔ دورانِ گفتگو میں یہ ذکر بھی ہوا۔حکیم صاحب تو سراپا عمل ہیں،فوراًاس خیال کوعملی جامہ پہنانے کو تیار ہوگیے۔ اسی مجلس میں کام کا خاکہ بنا۔ عنوانات تجویز ہوئے اور ایک نقشۂ عمل مرتب ہوگیا۔اور طے پایا کہ اس سلسلے کا آغاز اس ذاتِ قدسی صفات (ﷺ) کے تذکرے سے کیا جائے جو کائنات کا مقصود اورانسانیت کا منتہیٰ ہے۔جس کے مناقب و محاسن خود خلاقِ عالم نے بیان فرمائے اور جس کے ذکر کی رفعت و بلندی کا اعلان فرمایا کہ شاید اس ذات کی برکت سے ان اوراق کوبھی برکت حاصل ہواورانہیں بھی رفعت و قبولیت کا کوئی حصہ نصیب ہو۔آفتاب کی کرنیں ذروں میں بھی تابانی پیدا کردیتی ہیں۔کیا عجب کہ آفتاب کی ضیا باری ان اوراق کے مرتب اوراس تجویز کے مجوز کے دلوں کوبھی منور کردے''۔

مولانا عبدالسلام صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کوایک کامیاب انشاء پرداز اور مضمون نگار بتاتے ہوئے ان کی نگارشات کامختصر ذکر بھی کیا ہے۔

زیرِ بحث کتاب حکیم صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مرتبہ اور مولانا عبدالسلام قدوائی رحمۃ اللہ علیہ کے مجوزہ سلسلۃ الذہب کی تیسری کڑی ہے۔اس پر بھی مولانا عبدالسلام علیہ الرحمۃ ہی کا دیباچہ ہے۔تحریر فرماتے ہیں:

''محبّ مکرم حکیم شرافت حسین صاحب ''اللہ کے رسول (ﷺ)''اور''حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ'' کے حالات میں دو کتابیں لکھ چکے ہیں۔ان کتابوں کے طرزِ بیان اور طریقۂ تحریر کا ذکر پہلی کتاب '' اللہ کے رسول (ﷺ) '' کے دیباچے میں ہوچکا ہے۔ پیشِ خدمت کتاب حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے حالات میں ہے، اور اس کے ذریعے کوشش کی گئی ہے کہ بالکل ابتدائی بچوں اور بہت ہی معمولی تعلیم یافتہ اصحاب کوحضرت فاروقِ اعظم رضی اللہ عنہ کے حالاتِ زندگی سے واقف کیا جائے تاکہ وہ خلافتِ راشدہ کے مرکزی دور سے واقف ہوسکیں، اوراس عظیم المرتبت ذات کے حیرت انگیز کارناموں سے باخبر ہوسکیں جس نے مشرق سے مغرب اورشمال سے جنوب تک اسلام کا پیغام پہونچادیا تھا۔اسلام کے اثر سے دنیا کے باطل نظاموں کے پرخچے اڑگیے۔قیصرو کسری کے تخت ہائے عظمت و جلال الٹ گیے۔اور اسلامی اقتدار روئے زمین پر اس طرح چھا گیا کہ صدیوں تک اس میں جنبش نہ ہوسکی''۔

''اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ حکیم صاحب کی سابق کتابوں کی طرح یہ کتاب بھی مقبول ہو

اور پڑھنے والوں کے دلوں میں یہ حوصلہ پیدا ہو کہ وہ فاروقی شان سے دنیا میں پھر چھا جائیں۔اوراس عالم کی تریہ وتار فضا کونورِ اسلام سے منور کردیں۔''

راقم کی نگاہ میں علامہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ کی ''الفاروق'' بڑوں کے لیے ''تریاقِ فاروق'' ہے تو حکیم شرافت حسین کی ننھی منی کتاب ''حضرت عمر رضی اللہ عنہ'' چھوٹوں کے لیے ''کیمیائے سعادت'' ہے۔''الفاروق'' بے نظیر ہے تو ''حضرت عمرؓ '' اپنی مثال آپ ہے۔

باسٹھ (۶۲) صفحات پر مشتمل یہ چھوٹی کتاب جن ذیلی عنوانات پر مشتمل ہے، وہ اس طرح ہیں:

حضرت عمرؓ، حضرت عمرؓ اسلام سے پہلے، حضرت عمرؓ کی بہن اور بہنوئی کا اسلام، بہن اور بہنوئی پر سختی، ہجرت، مدینہ پر دشمنوں کے حملے، ایران سے جنگیں، شام، بیت المقدس، حضرت عمرؓ بیت المقدس جارہے ہیں، مصر میں اسلام کا بول بالا، شہادت، حضرت عمرؓ کی فوج اور فتح کا راز، حضرت عمرؓ اوران کی حکومت کے افسر، ملک کا انتظام، راتوں کو گشت کرتے تھے، پولیس کا محکمہ، جیل خانے، خزانہ یا بیت المال، ملک کی ترقی کے لیے اور چیزیں، نئے شہر، تعلیم، ملکوں ملکوں میں اسلام پھیلا ہے، حضرت عمرؓ کی خوبیاں۔ ہر عنوان کے ذیل میں سوالات درج کیے گیے ہیں تا کہ بچے سبق کی بازخوانی کر کے ان کو حل کرسکیں اوراپنی یادداشت مضبوط کرسکیں۔

حضرت عمرؓ ابھی اسلام کی دولت سے مالا مال نہیں ہوئے ہیں، جب کہ یہ دین حق ان کے گھر میں گھر کر چکا ہے، اور بہن فاطمہؓ اور بہنوئی سعیدؓ سچے اور پکے مسلمان بن چکے ہیں، لیکن عمرؓ کے سر میں گویا اسلام اور رسولِ اسلام (ﷺ) کی دشمنی کا سودا سمایا ہوا تھا اوران کے سینے میں بغض وعناد کی آگ سلگ رہی تھی۔ ایک روز غصہ اتنا بڑھا کہ تلوار لے کر شمعِ نبوت گل کرنے کی نیت سے چل پڑے۔ آگے کا حال حکیم صاحبؒ کے الفاظ میں:

''ایک روز غصے میں آکر تلوار ہاتھ میں لی۔ تلوار لے کر رسول اللہ (ﷺ) کی طرف راہ لی۔ توبہ توبہ رسول اللہ (ﷺ) پر وار کرنے چلے۔ توبہ توبہ ہمارے حضور (ﷺ) پر وار کرنے چلے۔ راستے میں حضرت نعیمؓ ملے۔ حضرت نعیم نے پوچھا: ''آپ کدھر کو چلے؟'' ۔حضرت عمرؓ نے سارا حال بتایا۔ رسول اللہ (ﷺ) کا نام لیا۔ اور اپنا کام بتایا۔ حضرت نعیمؓ نے کہا: ''پہلے اپنے گھر کی خبرلو۔ بہن کی خبرلو۔ بہنوئی کی خبرلو۔ تم کو معلوم نہیں۔ وہ اللہ پر ایمان لا چکے ہیں۔ اللہ کے رسول پر ایمان لا چکے ہیں۔'' حضرت عمرؓ راستے سے مڑے۔ راستے سے مڑکر بہن کے گھر چلے۔ بہن اپنے گھر میں قرآن پڑھ رہی تھیں۔ اللہ کا فرمان پڑھ رہی تھیں۔ حضرت عمرؓ کی آہٹ پا کر چپ ہوگئیں۔ چپ ہوکر قرآن چھپالیا۔ اور اپنا ایمان چھپالیا۔ حضرت عمرؓ بہن کا پڑھنا سن چکے تھے۔ بہن کا ایمان لانا سن چکے تھے۔ بہن سے پوچھا: ''تم کیا پڑھ رہی تھیں؟ مجھے بتانا تم کیا پڑھ رہی تھیں۔

میں سن چکا ہوں۔تم بتوں سے منہ موڑ چکی ہو۔اپنے پرانے دین کوتم چھوڑ چکی ہو''۔

یہ کہہ کر حضرت عمرؓ بہن بہنوئی پر ٹوٹ پڑتے ہیں، اور اپنا غصہ خوب اتارتے ہیں۔ اور دونوں کو لہولہان کر دیتے ہیں۔ پھر کیا ہوتا ہے، سنیے:

''جب بہن کا بدن خون سے تر ہو چکا۔ جب بہن کے کپڑے خون سے تر ہو گیے تو بہن نے جوش میں آ کر کہا: ''میں اللہ پر ایمان لا چکی ہوں۔ رسول اللہ (ﷺ) پر ایمان لا چکی ہوں۔ میں لا إلــه إلا الله کہہ چکی ہوں۔ میں محمد رسول اللہ کہہ چکی ہوں۔ مجھ کو تم اسلام سے ہٹا نہیں سکتے۔ مجھ کو تم ایمان سے ہٹا نہیں سکتے۔ بھائی نے بہن کے بدن سے خون بہتے دیکھا۔خون بہنے پر بھی لا إلــه إلا الله پڑھتے دیکھ۔ بھائی کی محبت میں جوش آیا۔اللہ نے اپنا رحم دکھایا۔ بھائی نے کہا: '' جو کچھ تم پڑھتی تھیں، مجھ کو سناؤ۔ جو کچھ تم پڑھتی تھیں، میرے پاس لاؤ''۔ اس نے قرآن لا کر آگے رکھ دیا۔ اللہ کا فرمان لا کر آگے رکھ دیا۔ بھائی قرآن پڑھتا تھا۔اور دل پر اثر لیتا تھا۔قرآن میں تھا: اللہ پر ایمان لاؤ۔قرآن میں تھا: اللہ کے رسول (ﷺ) پر ایمان لاؤ۔حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے پکارا: ''میں اللہ پر ایمان لاتا ہوں۔ میں اللہ کے رسول (ﷺ) پر ایمان لاتا ہوں۔

أشهـد أن لا إلــه إلا الله، و أشهـد أن محمداً رسول الله (ﷺ)''۔حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) کو پھر ایک جوش آیا۔ یہی جوش ان کو رسول (ﷺ) کے پاس لایا۔ننگی تلوار اب بھی ہاتھ میں تھی۔ اور ایمان کی دولت اب ساتھ میں تھی۔ننگی تلوار چمک رہی تھی۔ایمان کی دولت دمک رہی تھی۔تلوار کی چمک سب نے دیکھی۔لیکن ایمان کی دولت کس نے پرکھی۔تلوار دیکھ کر سب گھبرائے۔ کسی سے کچھ بن نہ آئے۔حضرت امیر حمزہ (رضی اللہ عنہ) نے کہا: ''حیران نہ ہو۔تلوار دیکھ کر پریشان نہ ہو۔ سچے دل سے آیا ہے تو آنے دو۔ ورنہ مجھ کو بھی تلوار آزمانے دو۔

''ادھر تھا یہ جوش جاری۔ ادھر رسول اللہ (ﷺ) پر تھی رحمت طاری۔حضور (ﷺ) نے فرمایا: ''عمر! تم کیوں آئے ہو؟ کیا خبر تم لائے ہو؟''۔حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے کہا: ''ایمان کی دولت لینے آیا ہوں۔اسلام کی دولت لینے آیا ہوں۔لا إله إلا الله کہنے آیا ہوں۔محمد رسول اللہ (ﷺ) پر ایمان لایا ہوں''۔ پیارے رسول (ﷺ) نے پکارا: **الله أكبر**، سب نے پکارا: **الله أكبر، الله أكبــــر** کے نعرہ سے مکہ گونج اٹھا۔مکہ گونج اٹھا۔ مکہ کی پہاڑیاں گونج اٹھیں۔ مکہ میں

اللہ أکبـــــر کی صدائیں تھیں۔مکہ کی پہاڑیوں میں **اللہ أکبر** کی صدائیں تھیں۔ اب اسلام کا بول بالا تھا۔اب اسلام کا نور و اجالا تھا۔مسلمان ابھی کافروں سے بہت دبتے تھے۔کعبہ میں نماز نہیں پڑھ سکتے تھے۔اب حضرت عمر (رضی اللہ عنہ) نے کعبہ میں نماز پڑھی۔اورسب مسلمانوں کے ساتھ پڑھی۔''

خلافت کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی ترجیحات حکیم صاحب کے سیدھے سادے جملوں میں:

''دنیا اب بھی اندھیری تھی۔اس اندھیری دنیامیں اسلام کا نور پھیلانا تھا۔ **لا إلـہ إلا اللہ** کا نعرہ ہر جگہ لگانا تھا۔ایک اللہ کی طرف سب کو بلانا تھا۔حضور (ﷺ) کا پیام ہر گوشے میں پہونچانا تھا۔دنیا کے ہر گوشے کو اسلام سے سجانا تھا۔سوئے ہوؤں کو جگانا تھا۔جاگتے ہوؤں کو سیدھی راہ پر لانا تھا۔کہیں آگ کی پوجا ہوتی تھی۔اس آگ کو بجھانا تھا۔اور اللہ کا نور پھیلانا تھا۔کہیں تین خدا مانے جاتے تھے۔ان تین خدا والوں کو سمجھانا تھا۔اور ایک خدا کا نام بتانا تھا۔کمزور ستائے جاتے تھے۔غریب ستائے جاتے تھے۔کمزوروں پر ظلم ہوتا تھا۔غریبوں پر ظلم ہوتا تھا۔کمزوروں کو ظلم سے بچانا تھا۔غریبوں کو ظلم سے بچانا تھا۔اور ظالموں کو سیدھی راہ پر لانا تھا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کام کو سنبھالا۔رسول اللہ (ﷺ) کے پیام کو سنبھالا۔اندھیری دنیا میں ہوا پھر سے اجالا۔ گرتی ہوئی دنیا کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے سنبھالا''۔

آخر میں سفر بیت المقدس کا کچھ حال سنیے:

''آپ کا معمولی لباس اور پیدل چلنا کسی کو نہ بھایا۔اپنے خلیفہ کو اس حال میں دیکھ کر ہر سردار شرمایا۔سب نے کہا:''عیسائی دیکھ کر کیا کہیں گے۔''ہم اس شرم کے ساتھ کیسے رہیں گے۔اور ایک عمدہ ترکی گھوڑا آیا۔عمدہ لباس ساتھ میں آیا۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ دیکھ کر فرمایا: اللہ نے ہم کو اسلام کی عزت دی۔اللہ نے ہم کو ایمان کی عزت دی۔اسلام سے بڑھ کر کون سی عزت ہے۔ ایمان سے بڑھ کر کون سی عزت ہے۔ترکی گھوڑا واپس ہوا۔عمدہ لباس واپس ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اسی طرح سے پیدل چلے۔اور معمولی لباس میں بیت المقدس میں داخل ہوئے۔ بیت المقدس میں اسلامی اخلاق کا نمونہ دکھایا۔ اسلامی اخلاق سے سب عیسائیوں کو اطمینان دلایا۔''

☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

ایک دلنواز شخصیت......ایک باوقار فنکار

ظہیر الدین ظہیرؔ رانی بنوری

عزیز بلگامی

azeezbelgaumi@hotmail.com

گزشتہ صدی کا آٹھواں دہا بڑے طمطراق سے گزر رہا تھا۔ بہ فضل تعالےٰ ہمیں زندگی کا ولولہ انگیز زمانہ، جوانی کی شکل میں میسر تھا۔ ہم اپنے دل میں اُمنگوں اور حوصلوں کی ایک حسین دُنیا بسائے ،اردو کی خدمت کو دین کی خدمت کے ساتھ جوڑ کر ایک طرف جذباتِ پاکیزہ کی عجیب سرشاری کا فیض حاصل کر رہے تھے تو دوسری طرف اپنے سینے میں عزائم کے ایک طوفان کی پرورش میں بھی مصروف تھے، جن کا تقاضہ یہ تھا کہ اللہ کے بندوں تک اللہ کا پیغام بذریعہ شعروسخن پہنچایا جائے ۔عزائم کے اِن ہی بے پناہ طوفانوں کے درمیان مشاعروں کی دُنیا میں ہمارا داخلہ ہوا تھاا ور ہماری خوب پذیرائی ہونے لگی تھی۔ یہ دنیا ہمارے لیے بالکل نئی تھی۔ ہم نے دیکھا تھا کہ یہاں پہلے سے ہی کچھ سر پھرے مگر شریف النفس شہسوارانِ ادب، قلمکار و ادباء اپنے ہاتھوں میں قلم کی تلوار تھامے ہوئے جہادِ فکر وفن میں مصروف ہیں۔ تھکے بغیر رکے بغیر ایک نا معلوم منزل کی سمت محوِ سفر ہیں۔ اُردو کی خدمت انجام دینے والے یہ مخلصینِ ادب اپنے بے مثال انہماک کے ذریعہ عوام کا دل موہ لینے کا مرحلہ طے کر چکے تھے۔ کیوں کہ اپنی زبان، اپنے ادب اور اپنی تہذیب کے لیے اِن کی والہانہ محبت نے اِن کی خدمات کے سر پر بے نفسی کا ایسا تنویر آفریں تاج رکھ دیا تھا کہ جسے جب بھی ہم جگمگاتا دیکھتے تو مسرور ہو اُٹھتے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہم ہر مشاعرے کا دعوت نامہ قبول کر لیتے اور مشعلِ اُردو اُٹھائے دیوانہ وار بستی بستی شہر شہر گھومتے رہتے۔ اِن شہروں میں گوکاک نامی ایک شہر بھی شامل ہے۔ گوکاک ضلع بلگام کا وہ شہر ہے جو بڑی پابندی کے ساتھ مشاعروں کے انعقاد کے سلسلے میں دور دور تک مشہور رہا ہے۔ خدمتِ شعروسخن کی یہ شمع ،ابوالکلام آزاد ہائی اسکول کے سخن پرور پرنسپل شرف الدین بیوپاری صاحب نے فروزاں کر رکھی تھی۔ پچیس سال قبل بنگلور منتقلی کے بعد اب وہاں کی صورتحال کی کسی خبر کے ہم غریب الوطنوں تک پہنچنے کا معاملہ قدرے مشکل ثابت ہوتا رہا ہے، الا یہ کہ کسی

بھولے بسرے ہم وطن سے اتفاقاً رابطہ پیدا ہو جاتا ہے تو برسبیلِ تذکرہ کسی مشاعرے کے انعقاد کا علم ہو ہی جاتا ہے۔ دراصل ہم وطنوں سے دور ہو جانے میں ہمارے نقلِ مکانی کا بھی بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔

اُس زمانے میں اپنے ایک مشاعرے میں محترم شرف الدین بیوپاری صاحب نے ہمیں بھی مدعو کر لیا تھا۔ ہوٹل کے جس کمرے میں ہم قیام پذیر تھے، اِتفاق سے وہاں مذکورہ خصوصیات کی حامل ایسی ہی ایک دلنواز شخصیت ہماری ہم نشین بنی ہوئی ہماری توجہ کا مرکز بن کر رہ گئی تھی...... ایک شریف النفس شہسوارِ ادب، فکر وفن کا جانباز مجاہد...... جو تھکے بغیر رکے بغیر اپنی منزل کی جستجو میں رہنے والا...... قرطاس وقلم سے وابستگی اور تخلیقی سرگرمیوں کے حوالے سے اپنے خلوص ومحبت کو شانِ بے نیازی کے ساتھ شہر شہر بستی بستی بانٹنے والا...... جی ہاں! یہ شخصیت ظہیر الدین ظہیر رانی بنوری صاحب کی شخصیت تھی جو آج بھی اپنی منزلِ مقصود کی تلاش میں سرگرداں نظر آتی ہے۔ ہم سے نہ جانے کتنے عرصے پہلے سے ظہیر بھائی مصروفِ شعر وسخن رہے تھے......!!

یہ ایک حقیقت ہے کہ ظہیر الدین ظہیرؔ کی شخصیت ہمیں پہلی ہی نظر میں اِس قدر بھا گئی تھی کہ محض دوستی نے ہی پینگیں نہیں بڑھائیں بلکہ دوست سے زیادہ اُن کا سرپرستانہ پیکر ہمارے لیے وجہِ کشش بن گیا۔ ظاہر ہے کسی کی زندگی میں ایک سرپرست کا جو مقام ہوتا ہے وہ نہ صرف دوستی بلکہ رشتہ داری سے بھی کہیں زیادہ بلند ہوتا ہے۔ دو دہوں تک شمالی کرناٹک کے تقریباً ہر مقام پر ہم ساتھ ساتھ مشاعرہ پڑھتے رہے اور ایک دوسرے سے فیض یاب ہوتے رہے، اور جب ہم بنگلور منتقل ہوئے تو ملاقاتوں کا سلسلہ اگرچہ کم ہوتا گیا لیکن ہماری رفاقتیں بعدِ مکانی سے متاثر نہ ہو سکیں۔ سچ پوچھا جائے تو مشاعروں میں ظہیر بھائی نے ہماری ابتدائی شعری کاوشوں کو اپنی والہانہ داد وتحسین سے مہمیز عطا کی تھی اور ہمیشہ ہماری پیٹھ تھپکی تھی۔ آج ہم جس مقام پر ہیں یہ ظہیر بھائی جیسے فراخ دل دوستوں کی بے لوث ہمت افزائیوں کی وجہ ہی سے ہیں۔ کیا یہ حقیقت وجہِ حیرت نہیں کہ اِن کی ہمت افزائیوں کا سلسلہ ۳۵ سال کی حدیں پھلانگ چکا ہے اور اُمیدِ قوی ہے کہ یہ تاحیات جاری رہے گا۔ آج جب وہ اپنے شہر میں میرے اعزاز کی بات کرتے ہیں تو دراصل وہ اپنا ہی قد اور اونچا کر دیتے ہیں اور ہم شرمندگی محسوس کرتے ہوئے یہ سوچنے لگتے ہیں کہ جو شخص خود اعزاز کا مستحق ہے وہ ہم جیسے ہیچمدانوں کے اعزاز کی بات کرتا ہے۔ کاش کہ اُردو کا بے حس ماحول اِس صورتِ حال پر تڑپ جائے اور ظہیر بھائی کی ادبی خدمات پر کم از کم ایک سمینار تو منعقد کر ہی لے اور اِس طرح اُن کا وہ قرض لوٹا دے جو اُردو دُنیا کی جانب سے واجب الادا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ کوئی اِس جرأت رندانہ پر کمربستہ ہو سکے گا۔ ظاہر ہے جہاں نفسی

نفسی کا عالم ہواور جہاں بازیگرانِ ادب کی اِس کے سوا کوئی مصروفیت نہ ہو کہ خودنمائی کو گلی گلی، کوچہ کوچہ بے پردہ کرتے پھریں، کوئی کسی کی خدمات کو سراہنے کے لیے کیوں کر آگے بڑھ سکے گا۔

اِس طویل تمہید کو ہم اِس مضمون کی اصل قرار دیتے ہیں۔ ظہیر بھائی کی شاعری اور فکروفن پر تو خیر کوئی بھی لکھ لے گا، بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے، ہم بھی کچھ نہ کچھ ضرور لکھیں گے۔ لیکن کسی فنکار کی شخصیت کے نمایاں پہلوؤں کا تذکرہ اُس کے فکروفن پر گفتگو سے زیادہ اہمیت کا حامل ہوتا ہے۔ کیونکہ کسی فنکار میں اخلاق و کردار، دلنوازی و انسان دوستی کے روشن پہلو موجود ہی نہ ہوں تو ایسے کسی شاعر و فنکار کے مجرد کلام ہی پر اِظہارِ خیال کی خاطر ایک مضمون کی تخلیق کا وقت نکالنا، میں سمجھتا ہوں وقت کا کوئی بہتر استعمال نہیں ہوگا۔ ہمارے آس پاس کئی باکمال شعراء موجود ہیں، جن کی شاعری......تبصروں اور مضامین کی متقاضی رہتی ہے، اور خود شعراء کے تقاضے بھی ہوتے ہیں جو ہماری توجہ کو کسی نہ کسی طرح اپنی جانب مبذول کرا ہی لیتے ہیں، لیکن المیہ یہ ہے کہ اُن کی شاعری کی مثال فکروفن کے لحاظ سے ایسی ہے جیسے کوئی بلند و بالا پربت ہو لیکن اِس کے مقابلے میں شاعرِ موصوف کا گھٹیا کردار اُسے ایک چھوٹے سے متعفن کیڑے کی مانند بنا دیتا ہے جو اپنی ہی شاعری کے اِس بلند و بالا پہاڑ کی وادی کے کسی نامعلوم گوشے میں جیسے رینگ رہا ہوتا ہے۔ گھر بڑا ہو تو ضروری نہیں کہ مکیں بھی بڑا ہی ہو۔ بلند و عالیشان مکانوں میں ہم نے بہت چھوٹے لوگوں کو رہتے بستے دیکھا ہے اور جس گھر میں داخلے کے وقت سر چوکھٹ سے ٹکرا جاتا ہے، وہاں ہم نے عظیم انسانوں کو مقیم دیکھا ہے۔

اِس منظرنامے میں بڑی مشکل سے کسی پر کچھ تحریر کرنے پر طبعیت آمادہ ہو پاتی ہے۔ کیوں کہ انسانیت سے عاری کسی شاعر کی شعری کاوشوں پر کسی تبصرے یا مضمون کے لیے مغز ماری اِن کے کرادار کو مزید بگاڑنے کا ہی موجب بن سکتی ہے۔ جان بوجھ کر نہ جانے یہ جوکھم خود تبصرہ نگار کیوں اُٹھا لیتے ہیں اور خود کو مجرم بنا کر کٹہرے میں کیوں کھڑے ہو جاتے ہیں۔!!......اللہ ہمیں تبصرہ نگاری کی ایسی کسی مشق سے محفوظ رکھے۔

لیکن ہمیں ناز ہے کہ ہم نے آج ایک ایسے قلم کار، شاعر و ادیب پر قلم اُٹھایا ہے جو اولاً تو ایک بلند کردار انسان ہے، ثانیاً، مستقل مزاجی کے ساتھ پانچ دہوں سے جو مصروفِ شعروسخن ہے اور گیسوئے اُردو کو نکھار رہا ہے سنوار رہا ہے۔ اِس Equation کو اُن کی زندگی میں ہم مستقلاً کارفرما دیکھتے ہیں اور یہی ہمارے اِس مضمون کا محرک بنا ہے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ ظہیرالدین ظہیر رانی بنوری پر قلم اُٹھا کر ہم وہ آسودگی محسوس کرتے ہیں جو کسی تبصرہ نگار کو مطلوب ہوتی ہے۔ اِس مضمون کی تخلیق نے طبعیت میں جو خوش گواری پیدا کردی ہے اِس سے لگتا ہے جیسے ہمارے

اپنے اندر کے تبصرہ نگار کو ایک عرصہ بعد سکون و قرار میسر آیا ہے۔ آیئے ظہیرؔ نامی سرتاپا انسانیت کے پیکر کے لیے اِس مخلصانہ خراجِ تحسین کے بعد اب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ قلم و قرطاس سے اُن کے رابطوں نے ادبی محاذ پر کیا کیا کچھ نتائج برآمد کیے، کیا کیا کچھ تخلیق کروایا اور اُنھوں نے ادبی معاشرت کی تشکیل و بقا میں کیسے کچھ عطیات پیش کیے۔

یہ ایک حقیقت ہے اور تجربے نے یہ بات ثابت کردی ہے کہ مشاعرے شاعروں کو کبھی ثبات و استحکام نہیں بخشتے۔ شاعر کے قدم تاریخ کی زمین پر اُسی وقت جم سکتے ہیں اور استحکام حاصل کر سکتے ہیں، جب کاغذ پر وہ ٹھہر جاتا ہے۔ اِس لحاظ سے ہم ظہیر بھائی کو فُل مارکس دیں گے۔ کیوں کہ اُن کے نام کے ساتھ کئی کتابوں کے مصنف ہونے کا لاحقہ مستقلاً لگا رہے گا۔ کرناٹک اُردو اکیڈیمی نے اِن کی تین کتابیں شائع کیں۔ ''کلیاں''، ''گلاب'' اور ''گلستاں''۔ یہ محاذ ادبِ اطفال کا تھا جس پر وہ اپنی دیگر شعری تخلیقات کے ساتھ سرگرمِ عمل رہے۔ ''تین مٹھی چاول'' اور ''وقت کی آواز''۔ ظہیر صاحب کی یہ دو کتابیں اُن کی غزلوں اور نظموں کے حوالے سے شاعری کا محاذ سنبھال لیتی ہیں، جن میں اب اُن کی ایک اور کتاب ''قطعاتِ ظہیر'' کے نام سے شامل ہوگئی ہے۔ جیسا کہ نام سے ظاہر ہے اِن میں ظہیر بھائی کے وہ قطعات شامل ہیں جو اُنھوں نے گزشتہ ۴۵ سالوں کے دوران مختلف حالات و واقعات سے متاثر ہوکر سپردِ قلم کیا۔ جن میں مختلف ادوار کی واقعاتی سرسراہٹ صاف سنائی دیتی ہے۔ اِس کتاب میں کچھ دوہے بھی شامل ہیں۔ ظہیر بھائی چونکہ ساری زندگی درس و تدریس کے شعبے سے جڑے رہے، اِس لیے اُنھوں نے اپنے طلباء کی زبان کو درست کرنے کے لیے دو ایسی کتابوں کی تصنیف کا موقع نکالا جو کسی زبان دان ہی سے ممکن ہو سکتا تھا۔ ''گرامر گائیڈ (انگریزی سے اُردو)'' اور ''گرامر گائید (انگریزی سے کنڑ)''۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اُنھیں کنڑی زبان میں بھی یدِ طولیٰ حاصل رہا۔ طلباء کے لیے اِن دو کتابوں کی تصنیف خود ہمارے لیے خوشگوار حیرت کا باعث بنی۔ اِن دو کتابوں کے حوالے سے لسان و زبان دانی کی تاریخ میں اُن کا نام یاد رکھا جائے گا تو یہ کوئی تعجب کی بات متصور نہیں ہوگی۔

موصوف کی دو کتابوں ''گلشنِ ظہیر'' اور ''قطعاتِ ظہیر'' کے مطالعے کے بعد ہمارا یہ احساس ہے کہ جس طرح ظہیر بھائی کی شخصیت کا خاص وصف اُن کی سادگی و منکسرالمزاجی ہے اِسی طرح نہ صرف اُن کی کتابیں سادگی کا مظہر ہیں، بلکہ اُن کی کتابوں کے نام بھی سادہ و پرکار ہیں۔ اُنھوں نے اپنی اِسی سادگی و سادہ بیانی سے سامعین کی بڑی تعداد کو متاثر کیا ہے۔ اُنھوں نے زبان کے طے شدہ معیارات و مزاج سے کبھی کھلواڑ نہیں کیا۔ دور از کار باتوں کو کبھی لسانی تراکیب سے بوجھل ہونے نہیں دیا۔ بات کہی

تو سچی، سیدھی اور صاف کہی۔ اتنی صاف کہ ایک معمولی آدمی تک اِس کی ترسیل ہو جائے۔ گلشنِ ظہیر کو میں محض بچوں کے لیے تخلیق کردہ کتاب نہیں سمجھتا بلکہ اِسے اُن کی شاعرانہ صلاحیتوں کی عکاسی کرنے والی کتاب قرار دیتا ہوں۔ اِسی طرح قطعاتِ ظہیر کو میں صرف عام قاری کی کتاب نہیں کہتا بلکہ اِس میں بچوں تک رسائی کے سارے امکانات کو موجود دیکھتا ہوں۔ چوں کہ بچوں کے ادب کی تخلیق اُن کے مقاصدِ ادب کی ترجیحات میں اول نمبر پر رہی اِس حقیقت کے ساتھ کہ ادبِ اطفال کی تخلیق کا معاملہ کوئی کھیل نہیں ہوتا، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُن کی کتابوں میں اُسلوب و اِظہار کا فکری ولسانی پہلو ہمیشہ بچوں کی سطحِ فہم کی رعایت کے ساتھ ہی غالب رہا نہ کہ اِس سے بے نیاز ہو کر۔ شاید اِسی لیے یا تو اِس سے بڑی عمر والے پہلے متاثر ہوجاتے ہیں پھر اپنے بچوں کو پڑھوانے کے لیے بے تاب ہوجاتے ہیں، یا اِس سے بچے پہلے متاثر ہوجاتے ہیں اور پھر اپنے بڑوں کو پڑھوانے کے لیے بے چین ہو اُٹھتے ہیں۔ اِس تاثراتی مضمون کے اختتام پر ہم قطعات ظہیر سے چند پسندیدہ قطعات نذرِ قارئین کرتے ہیں:

کیسے کیسے سپردِ خاک ہوئے
کون باقی رہا ہے دُنیا میں
ہاں وہی مر کے بھی امر ہے جو
کام اچھے کیا ہے دُنیامیں

*

دوستوں نے ہی کردیا رُسوا
دوستوں کی بڑی عنایت ہے
اپنے حصہ میں کرب وغم آہیں
کیا کہیں کیسی کیسی دولت ہے

*

ہر نگر ہر گلی ہے خطرے میں
ہر جگہ زندگی ہے خطرے میں
فرقہ وارانہ جنگ ہے ہر سو
ایکتا گھر گئی ہے خطرے میں

*

جب بھی ملتاہوں دوستوں سے میں
رنج وغم سارے بھول جاتا ہوں
میری پہچان گر کوئی پوچھے
دوستوں کے پتے بتاتا ہوں

خدا کرے کہ ملت کا یہ وفا شعار فنکار اِسی طرح اپنی فنکاری کا جادو جگا تا رہے۔آمین۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

دکن میں اردو کا آغاز و ارتقا

محمد شاداب خان
شعبۂ دینیات ،اے،ایم،یو،علی گڑھ

اردو دہلی اور اس کے نواح کے علاقے میں پیدا ہوئی اور علاالدین خلجی، ملک کافور اور محمد تغلق کے حملوں کی وجہ سے دکن پہونچی، جہاں اس کو مختلف نام دیے گئے ، مثلاً، ہندی، ہندوی، گوجری، گجری، ، دکنی، مسلمانی، ترکاماٹا، زبان اہل ہند، زبان دہلی، زبان ہندوستان وغیرہ۔ دکنی اسی اردو کا وہ قدیم روپ ہے جو تیرہویں صدی عیسوی سے سترہویں صدی عیسوی تک دکن اور گجرات میں پروان چڑھتا رہا۔

۱۷۰۰ء میں جب دہلی میں ''ریختہ'' کے نام سے اردو شاعری کا احیا ہوا تو دہلی کی زبان دکنی سے بہ اعتبار صوتیات وصرف ونحو وغیرہ کسی قدر مختلف ہوگئی اور معیاری اردو کہلائی اور اس کی وہ شکل جو دکن میں تھی اسے دکنی کہا جانے لگا۔ دکن کے اولین مراکز گجرات اور دولت آباد تھے۔ چنانچہ دکنی زبان ''گوجری'' اور ''گجری'' بھی کہلائی۔ ڈاکٹر چٹر جی گجری کی وجہ تسمیہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں: دکنی کا نام گجری، اس کی اصلیت اور مشابہت کا آئینہ دار ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے گوجر جنہوں نے پنجاب کے شہروں کو گجرات اور گوجرانوالہ کا نام دیا شمالی ہند کی فوجوں کے ساتھ ہجرت کر کے دکن گیے تو انہوں نے اپنے نام اور بولی کو کچھ دن کے لیے زندہ رکھا۔ شوکت سبزواری کے خیال میں :۔''دکنی، گجری، گجراتی دراصل وہی زبان ہے جو دلی سے ان علاقوں میں پہونچی، البتہ ان میں مقامی الفاظ اور ترکیبیں شامل ہوگئیں'' دکنی کا علاقہ دکنی اور گجراتی کے اس اختلاط کی وجہ یہ ہے کہ ''دکنی'' کا لسانی خطہ جنوب کی مختلف ریاستوں یعنی گجرات، مہاراشٹر، آندھرا، میسور، تامل ناڈو کے موجودہ علاقوں پر مشتمل تھا جہاں اردو زبان کا یہ روپ دکنی کی شکل میں ترقی کرتا رہا، جو بہ اعتبار صوتیات صرف ونحو، لغت وعروض معیاری اردو سے مختلف تھا۔ اس کی وجہ سے بعض علما دکنی کو اردو سے علیحدہ زبان تسلیم کرنے لگے۔ ڈاکٹر محی الدین قادری زور، جنہوں نے ''دکنی'' کی بازیافت میں نمایاں حصہ لیا اور محمود شیرانی، جنہوں نے اردو کے آغاز کے بارے میں سب سے پہلے قلم اٹھایا ''دکنی اور پنجابی'' کی جزوی مماثلتوں کی بنا پر دکنی کا ماخذ پنجابی قرار دیتے ہیں۔ ڈاکٹر زور ہندوستانی صوتیات میں معیاری اردو کو کھڑی بولی سے مشتق اور ''دکنی'' کو'' پنجابی'' سے مشتق بتاتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر چٹر جی، ڈاکٹر ژول بلاک اور ڈاکٹر مسعود حسین خاں کی

تحقیقات کی رو سے:۔’’دکنی‘‘،معیاری اردو کا قدیم روپ ہے جس کا ہیولیٰ،نواحِ دہلی کی بولیوں،کھڑی،ہریانی اور میواتی سے تیار ہوا‘‘۔دکن کا علاقہ ایک آریائی زبان مراٹھی سے بھی گھرا ہوا ہے اس لیے’’دکنی‘‘ نے مراٹھی اور اس سے قبل مہاراشٹری پراکرت کا خاصا اثر قبول کیا۔

اس کے علاوہ دراوڑی خاندان کی زبانوں،تامل، تلنگی، ملیالم، کنڑی سے گھری ہونے کی وجہ سے تلنگی، کنڑی اور تامل کے بعض الفاظ بھی دکنی میں شامل ہو گیے۔لیکن ان زبانوں کے اثرات سے اردو قواعد محفوظ رہی۔حقیقت یہ ہے کہ(۱) دکنی بہ استثنائے چند الفاظ اور اختلافات تلفظ،سلاطینِ دہلی کے عہد کی اردوئے قدیم کے سوااور کچھ نہیں۔(۲)’’دکنی‘‘ کی فرہنگ اور خصوصیات صرف ونحو کی توجیہ نواحِ دہلی کی بولیوں، بالخصوص ہریانی اور کھڑی سے مکمل طور پر کی جا سکتی ہے۔(۳)’’دکنی‘‘ نہ تو برج بھاشا سے نکلی نہ پنجابی سے۔اس کا مولد ومنبع نواحِ دہلی کی بولیاں ہیں۔دکنی’’صوتی تغیر‘‘ کے زیرِ اثر معیاری اردو بنی۔’’دکنی‘‘ یا اردوئے قدیم کی لسانیات کی مندرجہ ذیل خصوصیات ایسی ہیں جو بعد کے مرحلے میں نہیں ملتیں،مثلاً:صوتی خصوصیات مصوتوں کی سطح پر اردوئے قدیم یا دکنی کی سب سے بڑی خصوصیت تخفیفِ صوت ہے یعنی:۔(۱) اسمان بجائے آسمان (۲) ہائے ہوز کی تخفیف جیسے یہاں کے بجائے یاں (۳) دکنی میں بعض اوقات’’ہ‘‘ زائد کر دی جاتی ہے جیسے مٹی کے بجائے مٹھی۔(۴)’’ق‘‘ اور’’کھ‘‘ کی جگہ ’’خ‘‘ کی آواز جیسے’’صندوخ‘‘ بجائے’’صندوق‘‘’’راخ‘‘ بجائے’’راکھ‘‘۔(۵)’’گ‘‘ کی جگہ’’غ‘‘ کی آواز مثلاً ’’اغال دان‘‘ بجائے’’اگال دان‘‘۔ (۶)’’دکنی کا‘‘ میلان تشدید حرف کی طرف ہے جیسے چونا کے بجائے چنّا۔پھیکا کے بجائے پھکّا۔صرفی خصوصیات جمع بنانے کے لیے’’اں‘‘ کا استعمال جیسے’’کھیت‘‘ کی جمع’’کھیتاں‘‘۔صرفی سطح پر دکنی زبان کی ایک خاص کلید’’چ‘‘ تاکید کا استعمال ہے۔ چ تاکیدی کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ مراٹھی سے مستعار لی گئی ہے۔دکنی کی ایک اور خصوصیت یہ بھی ہے کہ دکنی لکھنے والوں نے عربی فارسی الفاظ کی بھی’’تارید‘‘ کی نیز اپنا رشتہ کھڑی بولی اور شورسینی اپ بھرنش سے استوار رکھا،جس کے توسط سے وہ سنسکرت کے بھی قریب رہی چنانچہ دکنی لفظیات پر سنسکرت کے’’تت سم‘‘ الفاظ کا چلن رہا’’تدبھو‘‘ الفاظ دکنی نے قبول کیے،جیسے صنم کے بجائے’’پیو‘‘ یا’’پیا‘‘ محبت کے لیے پریم۔دکنی کی ایک اور خصوصیت ہکار حروف کی تخفیف بھی ہے جیسے سدھی بجائے سدی۔باندھنا کے بجائے باندنا۔دکنی میں نیم مصوتے عام ہیں جیسے پٹا۔ڈبا وغیرہ۔دکنی میں جملوں کی ساخت میں فعل کو فاعل کے مطابق لایا جاتا ہے مثال کے طور پر لڑکی لڈو کھائی۔لڑکیاں کاماں کرتیاں۔دکنی نے اپنی ہمسایہ زبانوں تلنگی، کنڑی سے بھی الفاظ مستعار لیے جیسے کنڑی کا بچّا بہ معنی دیوانہ۔تلنگی کے الفاظ بونتا، دھپڑا، گھڑسی، راوٹی، بنڈی۔واوعطف جوشمالی ہند کی اردو میں صرف فارسی عربی الفاظ کے درمیان لایا جاتا ہے،دکنی میں ہندآریائی اور عربی فارسی الفاظ کے درمیان بھی مروج ہے جیسے : گھر و دولت۔دولت (فارسی)+گھر (ہندی) اس اختلاف کی وجہ یہ تھی کہ دکن وگجرات کی اردو نے پنجابی کے علاوہ راجستھانی،

گجراتی، برج زبانوں کے اثرات بھی قبول کیے تھے، مثلاً ہمنا، تمنا، راجستھان زبانوں کے ضمائر دکنی والوں نے اپنائے۔ اس وجہ سے ''دکنی'' اور ''معیاری اردو'' دو الگ الگ دھارے بن گیے۔

تیرہویں صدی سے سترہویں صدی تک دکنی ادب کے کئی اہم کارنامے منظر عام پر آئے۔ دکنی میں تصنیف و تالیف کا سلسلہ ۱۸۶۷ء تک برقرار رہا چنانچہ ۱۸۶۷ء میں حیدرآباد کے ایک صوفی فقیر اللہ شاہ حیدر نے نہال چند لاہوری کی تصنیف ''بکاولی'' کے مقابل میں اپنی تصنیف ''تناولی'' پیش کی۔ باقر آگاہ اپنی مثنوی ''گلزارِ عشق'' کے دیباچے میں جو ۱۷۹۶ء میں لکھی گئی ''دکنی'' پر کیے ہوئے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:۔ ''مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلانِ و ہرزہ سرایانِ زبان دکنی پر اعتراض اور ''گلشنِ عشق''، ''علی نامہ'' کے پڑھنے سے احتراز کرتے ہیں اور جہلِ مرکب سے نہیں جانتے کہ جب تک ریاست سلاطین دکن کی قائم تھی زبان ان کی درمیان ان کے خوب رائج تھی اور طعن شماتت سے سالم تھی۔ اکثر شعرا وہاں کے ابن نشاطی، فراقی، شوقی، خوشنود، غواصی، ایاغی، ہاشمی، شغلی، بحری، نصرتی، مہتاب وغیرہ ہم نے اپنی زبان میں بے حساب قصائد، غزلیات، مثنویات اور قطعات رقم کیے اور داد سخنوری کا دئے''۔

دکنی کے ادوار دکنی کی ترقی کا اندازہ لگانے کے لیے دکنی ادب کی تاریخ کو ان چار ادوار میں منقسم کیا جاتا ہے۔ پہلا دور:۔ گجرات میں دکنی یا قدیم اردو کا چلن۔ دوسرا دور:۔ ۱۳۲۴ء سے ۱۶۸۱ء تک علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق کے حملوں کے بعد بہمینہ سلطنت کے قیام اور بہمینہ سلطنت کے سقوط کے بعد گولکنڈہ، بیجا پور اور احمد نگر کے شمالی ہند میں انضمام تک۔ تیسرا دور:۔ اورنگ زیب کے عہد میں دکنی کا اہم مرکز اورنگ آباد تھا۔ چوتھا دور:۔ دورِ آصفی۔ مرکز گجرات گجرات میں اس زبان کی سرپرستی حضرت عین الدین گنج العلم، شاہ علی جیوگام دھنی، بہلاء الدین باجن، شیخ خوب محمد چشتی، جیسے علما و صوفیا نے کی۔ شاہ علی جیوگام دھنی نے اپنی یادگار ایک اردو دیوان ''جواہر اسرار اللہ'' چھوڑا۔ شیخ خوب محمد نے اپنے مرشد بہاء الدین باجن کے کلام کی شرح ''خوب ترنگ'' کے نام سے لکھی۔ مابعد کے زمانے میں محمد امین گجراتی کی تصنیف ''یوسف زلیخا'' قدیم اردو کی اہم تصنیف ہے۔ سید علی جیوگام دھنی کے کلام کو ان کے ایک شاگرد نے ترتیب دیا اس میں ان کی شاعری کے متعلق لکھتا ہے۔ ''دربیان توحید و اسرار باالفاظ گجری بطریق فرمودہ'' یہ نام گجری اور گوجری دکنی کے لیے اس دور میں خاصہ مقبول رہا۔ چنانچہ بیجاپور کے مشہور صوفی شاہ برہان الدین جانم اپنی تصانیف ''کلما لحقائق'' اور ''حج البقاء'' میں دکنی کو گجری کے ہی نام سے یاد کرتے ہیں۔

گجرات کے ساتھ دکنی کی سرپرستی دکن کی جن سلطنتوں نے کی ان میں سلطنت بہمینہ اور اس کے انقراض کے بعد عادل شاہی، قطب شاہی، نظام شاہی، عماد شاہی، برید شاہی وغیرہ مشہور ہیں۔ بہمینی سلطنت کے زمانے میں دکنی کی ترقی علاء الدین خلجی ملک کافور نے ۱۳۱۰ء تک دکن کا کچھ حصہ فتح کر لیا تھا ۱۳۲۳ء میں محمد تغلق نے دیوگڑھی دولت آباد کو

ہندوستان کا پائے تخت بنایا اور دہلی سے کثیر پیمانے پر آبادی کا انتقال عمل میں آیا۔ اس طرح ''دکنی'' (قدیم اردو) خاص طور سے مہاراشٹر (دولت آباد) کے اطراف کے علاقے میں تیزی سے پھیلنے لگی۔ کیونکہ دکن میں مراٹھی، کنڑی، تلنگی اور تامل زبانیں بولی جاتیں تھیں، اس لیے اردو یا دکنی ہی مشترک زبان کے طور پر حاکم ومحکوم کے مابین ارتباط کا ذریعہ بنی۔ دکنی کی اشاعت وترویج دو محاذوں سے ہوئی ''خانقاہ'' اور ''دربار'' خانقاہوں میں صوفیا نے عقائد و مذہب کی تبلیغ کا ذریعہ اس مشترک زبان کو بنایا جو دکن میں مقبولیت حاصل کر رہی تھی، اس لیے جب محمد بن تغلق کے خلاف دکنی امرا نے علمِ بغاوت بلند کر کے علاء الدین حسن بہمنی کو اپنا فرماں روا تسلیم کیا تو دربار میں بھی اس زبان کی سرپرستی کی گئی۔ بہمنی خاندان کے حکمرانوں نے جہاں مقامی زبانوں کی سرپرستی کی وہیں عربی، فارسی، اردو (دکنی) کو بھی فروغ دیا۔ بہمنی دور کے اکثر فرماں روا علم دوست اور ادب پرور تھے۔

احمد شاہ بہمنی کے زمانے میں حضرت سید بندہ نواز گیسو دراز دکن تشریف لائے آپ نے عربی فارسی کی تصانیف کے علاوہ چند رسائل ''دکنی'' میں تصنیف فرمائے، اور بعض رسائل کو غلط طور پر آپ سے منسوب کر دیا گیا۔ بہرحال یہ امر مسلم ہے کہ اس زمانے تک دکنی زبان میں اتنی سکت آ گئی تھی کہ وہ اظہار خیال کا ذریعہ بن سکے۔ خواجہ بندہ نواز کے خلفاء اور تلامذہ میں بھی کئی نے اس زبان میں تصنیف وتالیف کا کام کیا۔ بہمنی دور کے مشہور شعرا اور ادبا جن کے کارنامے منظر عام پر آ چکے ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱۔ حضرت عین الدین گنج العلم گجرات سے دکن تشریف لائے۔
۲۔ سید محمد حسینی بندہ نواز گیسو دراز
۳۔ حضرت اکبر حسینی
۴۔ حضرت عبداللہ حسینی
۵۔ نظامی۔ مصنف کدم راو پدم راؤ
۶۔ امیر الدین شاہ میراں جی شمس العشاق
۷۔ فیروز مصنف پرت نامہ یا توصیف نامہ میراں محی الدین
۸۔ اشرف مصنف نوسرہار

ان کے علاوہ احمد، محمود، آذری، خیالی وغیرہ کے بھی نام ملتے ہیں۔ ۱۵۶۷ء مطابق ۹۳۹ھ میں بہمنی حکومت کمزور ہو گئی اور اس کے پانچ صوبوں، یعنی بیجاپور، گولکنڈہ، احمد نگر، برار اور بیدر کے صوبہ داروں نے بغاوت کر کے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا۔ بیجاپور میں عادل شاہی، گولکنڈہ میں قطب شاہی، احمد نگر میں نظام شاہی، اور بیدر میں برید شاہی سلطنتوں کی بنیاد پڑی جس میں سے برید شاہی اور عماد شاہی سلطنتیں کمزور ہونے کے باعث عادل شاہی نظام شاہی اور قطب شاہی میں ضم ہو گئیں۔ بیدر کی برید شاہی کو عادل شاہی سلطنت نے برار کی عماد شاہی کو احمد نگر کی نظام شاہی حکومتوں نے ختم کر دیا۔ بقیہ تین سلطنتوں کے حکمرانوں یعنی عادل شاہی، قطب شاہی اور نظام شاہی سلطنتوں نے نہ صرف شعر و ادب کی سرپرستی کی بلکہ خود بھی اس زبان کو ادبی اظہار کا وسیلہ بنایا۔

سلطنت قطب شاہی: قطب شاہی خاندان کے پانچویں

فرمانروا محمد قلی قطب شاہی جس نے پچاس ہزار کے قریب شعر کہے یہ اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر تھا۔

اس خاندان کے دوسرے فرماں رواؤں سلطان محمد، سلطان عبد اللہ، اور ابوالحسن تانا شاہ نے بھی اس زبان میں شاعری کی۔لیکن ظل اللہ کوزور صاحب نے سلطان محمد قطب شاہ کا تخلصی بتایا ہے وجہی اس عہد کا مشہور شاعر اور نثر نگار ہے جس نے نظم میں ''قطب مشتری'' لکھنے کے علاوہ نثر میں ''سب رس'' لکھ کر دکنی نثر کو ادبی رنگ دیا۔ ابھی تک دکنی نثر صرف مذہبی اور فلسفیانہ موضوعات کے لیے استعمال کی جاتی تھی۔ وجہی پہلا شخص تھا جس نے اس زبان کے لیے ''دکنی'' کا لفظ استعمال کیا اگرچہ سب رس میں ہی اپنی زبان کو ''زبان ہندوستان'' کہتا ہے۔وجہی کے علاوہ اس عہد کے دوسرے اہم شاعر غواصی اور ابن نشاطی ہیں۔غواصی (مثنوی سیف الملوک و بدیع الجمال، طوطی نامہ، مینا ست ونتی، ابن نشاطی کی مثنوی پھول بن، جو ایک فارسی مثنوی بساتین کا ترجمہ ہے، شاعرانہ صنعت گری کا کمال ہے،جن میں مصنف نے انتالیس صنعتیں استعمال کی ہیں۔ اس دور کے دوسرے مشہور شاعر اور ادیب حسب ذیل ہیں:

۱۔ حسن شوقی ۲۔ جنیدی (مثنوی ماہ پیکر) ۳۔ قطبی (تحفۃ النصائح) ۴۔ سلطان (دیوان) ۵۔ سید بلاقی (معراج نامہ) ۶۔ شاہ راجو، میراں جی خدا نما (تمہیدات عین القضاء) ۷۔ طبعی (بہرام وگل اندام) ۸۔ سیوک (مرثیے) ۹۔ خواص (مرثیے) ۱۰۔ غلام علی خان لطیف (ظفر نامہ محمد حنیف) ۱۱۔ غلام علی (مصنف پدماوت) ۱۲۔ احمد (مصنف لیلیٰ مجنوں) ۱۳۔ افضل قصیدہ گو۔

ان مصنفین کی زبان قدیم اردو یا دکنی کے مستند نمونے پیش کرتی ہے یہ اپنی زبان کو ''دکنی'' کہتے ہیں۔ابن نشاطی کہتا ہے اسے ہر کسی کے تئیں سمجھا کو توں بول- دکن کی بات سوں سرّ یاں کو کہہ کھول۔ایک گمنام شاعر کہتا ہے۔

دکنی میں مجکوں مہارت ایتی
کہ النصر منکم کہے نصرتی

عادل شاہی: بیجا پور کی عادل شاہی سلطنت نے بھی قطب شاہیوں کی طرح دکنی کی سرپرستی کی۔اس خاندان کے دو فرماں روا ابراہیم عادل شاہ ثانی اور علی شاہ ثانی المتخلص بہ شاہی نے دکنی میں شاعری بھی کی۔ابراہیم عادل شاہ نے نورس میں برج بھاشا کے علاوہ بعض گیت دکنی میں بھی لکھے تھے اگر چہ ان گیتوں پر برج بھاشا کا اثر زیادہ غالب ہے تاہم اس کے درباری شاعر عبدل کی مثنوی ''ابراہیم نامہ' شمالی ہند کی دہلوی اور جنوبی ہند کی دکنی کا بڑا اچھا امتزاج پیش کرتی ہے۔اس شاعر نے اپنے آپ کو دہلوی ظاہر کرتے ہوئے دکنی میں لکھنے پر فخر کیا ہے۔علی عادل شاہ شاہی کا دیوان محمد قلی کے دیوان کی طرح تمام اصناف پر محیط ہے۔

ان بادشاہوں کے علاوہ بیجا پور کے صوفیا نے بھی اردو نثر و نظم کو مالا مال کیا۔ان میں شمس العشاق میراں جی، ان کے بیٹے برہان الدین جانم اور پوتے شاہ امین الدین اعلی و نیز ان کے خلفا و تلامذہ شامل ہیں۔شاہ میراں جی شمس العشاق کی تصانیف لسانی اہمیت کے حامل ہیں مثنوی شہادت الحقیقت، خوش نامہ، خوش نغز، مغز مرغوب کے مخطوطات مختلف کتاب

خانوں میں موجود ہیں۔شاہ برہان الدین جانم کی تصانیف میں کلمۃ الحقائق (نثر) سکھ،سہیلا،مثنوی ارشاد نامہ،مثنوی بشارت الذکر وغیرہ دستیاب ہیں۔ شاہ امین الدین اعلیٰ نے بھی کئی مثنویاں لکھیں۔گفتار شاہ امین،محبّ نامہ اور گنج مخفی وغیرہ شائع ہو چکی ہیں۔اس کے علاوہ عادل شاہی دور کے جن شعرا و ادبا کے کارنامے دستیاب ہوئے ہیں وہ حسب ذیل ہیں۔

مثنوی ابراہیم نامہ از عبدل،مثنوی چندر بدن و ماہ از مقیمی ،مثنوی کشف الوجود مثنوی کشف الانوار از شاہ داول، مثنوی بہرام وحسن بانو از امین و دولت،مثنوی فتح نامہ از نظام شاہ،مثنوی میز بانی نامہ از حسن شوقی۔

حسن شوقی کا تعلق دکن کے تینوں درباروں سے رہا۔مثنوی قصہ بے نظیر اور گلدستہ از صنعتی،مثنوی نجات نامہ از ایاغی،مثنوی جنت سنگار از ملک خوشنود،مثنوی خاور نامہ از رستمی (۲۴ ہزار اشعار پر مشتمل رزمیہ مثنوی لکھی جو اردو کی سب سے ضخیم مثنوی مانی جاتی ہے۔(مثنوی علی نامہ، گلشن عشق و تاریخ اسکندری از ملک شعرا بیجاپور ملا نصرتی مثنوی یوسف زلیخا از ہاشمی، دیوان ہاشمی (ریختی) بھی اہم ہیں۔اس کے علاوہ مثنوی قصص الانبیاء از قدرتی، مثنوی اسرارِ عشق از مومن مثنوی گنج مخفی، شجرۃ الاتقیا، نظم سی حرفی، دیوان شاہ معظم از معظم، روضۃ الشہدا از سیوا وغیرہ۔ مغل عہد ۱۶۸۶- ۱۷۵۰ء سترہویں صدی عیسوی میں دکن کی سلطنتوں عادل شاہی،قطب شاہی اور نظام شاہی کا مغل سلطنت میں انضمام عمل میں آیا۔اس دور میں مرثیہ گوئی کی کافی ترقی ہوئی۔ڈاکٹر زور اس کا سبب یہ بتاتے ہیں کہ اورنگ زیب اور اس کے کارندوں کی سیاست کے ڈر سے دکنی ادیب اور شاعر اپنے جذبات و خیالات کو صاف ظاہر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے انہوں نے مرثیے کو اپنے جذبات کے اظہار کا وسیلہ بنالیا۔

اس دور میں جن شاعروں اور ادیبوں نے دکنی میں اپنے کارنامے چھوڑے وہ مندرجہ ذیل ہیں۔قاضی محمود بحری (من لگن و بنگاب نامہ اور دیوان) پیرزادہ روحی ہاشم علی، مرزا، ضیفی (ہدایات ہندی)،شاہ عنایت (نور نامہ)،شاہ عبد الرحمٰن قادری (مصنف باغ حسینی)، سید محمد خان عشرتی (مصنف دیپک پتنگ و چت لگن) عشرتی کے فرزند سید احمد خان ہنر بھی صاحبِ تصنیف تھے۔ان کی مثنوی ''نیہہ درپن'' جو پھول بن کے جواب میں لکھی گئی خاصی اہم ہے۔ یہ مثنوی اس زمانے کی دکنی تہذیب کی عکاس ہے۔ ہنر نے اس زمانے کی سجاوٹ اور زیبائش، کھانوں ، سالنوں ، میٹھوں وغیرہ کا تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ شاہ حسین ذوقی کی تصانیف بحر العرفان، وصال العاشقین ، وفات نامہ، ماں باپ نامہ،غوث نامہ مذہبی رنگ کی ہیں۔اس دور کا ایک اور مشہور شاعر وجیہہ الدین وجدی ہے۔جس کی تصنیف ''پنچھی باچھا'' ہے۔ یہ منطق الطیر کا ترجمہ ہے اور باغ جاں فزا اور تحفۂ عاشقاں بھی فارسی صوفیانہ مثنویوں کے تراجم ہیں۔لیکن ولی اورنگ آبادی اس پورے دور کے سب سے اہم شاعر ہیں۔ان کی شاعری کو بجا طور پر عہد آفریں اور عہد ساز کہا جا سکتا ہے۔اورنگ زیب نے بیجاپور، احمد نگر اور حیدر آباد کی رونق تو کم کر دی وہاں کی محفلیں اجڑ گئیں اور چہل پہل ختم ہوئی لیکن اس کی وجہ سے اورنگ آباد شعر و ادب، علم و فن اور تہذیب و ثقافت کا ایک ایسا

مرکز بن گیا جس کی اہمیت اورنگ زیب کی وفات کے تقریباً ایک صدی بعد تک قائم رہی۔ بیجا پور اور حیدرآباد کے باقی ماندہ شعرا وہاں جمع ہوگیے۔ ولی کے علاوہ اس عہد کے دکنی شعرا میں سراج اور عزلت دوسرے اہم شاعر ہیں جنہوں نے دکنی بالخصوص قدیم غزل کو نئی آب و تاب دی۔ لیکن ولی کی اہمیت اس وجہ سے ہے کہ ولی نے دلی کا سفر کیا اور وہاں کے مشاعروں میں اپنا کلام سنا کر وہاں کے شاعروں کو اردو کی طرف مائل کیا۔ یہ گویا مفتوح کی فاتح پر فتح تھی۔ کیونکہ شمالی ہند کی فوجوں نے دکن پر سیاسی فتح حاصل کی تھی۔ لیکن دکن کے اسی شاعر نے فاتح پر ادبی فتح حاصل کر لی اور اس زبان کا ڈنکا دہلی کے مشاعروں اور محفلوں میں اس طرح بجوایا کہ ''دکنی'' وہاں کی محفلوں کی جان بن گئی اور دلی کے شعرا نے اسے ریختہ کا نام دے کر شاعری کے ایک نئے دور کا آغاز کیا۔ چنانچہ شمالی ہند کے شاعروں اور تذکرہ نگاروں نے ولی ہی کو اردو کا پہلا صاحبِ دیوان شاعر سمجھ لیا۔

ولی کے علاوہ جن دکنی شعرا نے دہلی میں شہرت حاصل کی ان میں فقیر اللہ آزاد اور فراقی مشہور ہیں۔ لیکن دہلی میں ''دکنی'' نے بہت جلد اپنی ہیئت تبدیل کر لی۔ مرزا مظہر جان جاناں اور حاتم نے ''اصلاحِ زبان'' کی تحریک شروع کی جس کے تحت دکنی کی لفظیات کو تبدیل کیا۔ دکنی سے برج، راجستھانی، پنجابی اور کھڑی کی آمیزش ختم کر کے اسے عربی اور فارسی کے قریب کر دیا۔ اس کا ثبوت دیوان زادہ حاتم کا فارسی پیش لفظ ہے جس میں حاتم نے وضاحت کر دی کہ ''ملک کی زبان اور ہندوی کہ اس کو بھاکا کہتے ہیں موقوف کر کے فقط روز مرہ کہ عام فہم اور خاص پسند تھا اختیار کیا۔ اس کے بعد لکھتے ہیں کہ: ''اس انتخاب میں قدیم (دکنی) طرز کے اشعار میں نے نہیں درج کیے اگر کوئی ملیں تو مجھے معاف کیجیے'' اس طرح اٹھارویں صدی کے اوائل تک دکنی، صوتی تغیرات کے زیر اثر شمال میں ''اردوئے معلیٰ'' بن گئی۔ لیکن جنوبی ریاستوں جیسے مدراس، کرناٹک اور حیدرآباد میں ۱۸۶۷ء تک اسی زبان میں تصنیف و تالیف کا کام ہوتا رہا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی نے جب مدراس میں اپنے قدم جمائے تو انہوں نے فورٹ سینٹ جارج کالج کے معلمین سے دکنی میں کتابیں لکھوائیں، جس کا نمونہ ''انوار سہیلی'' مصنفہ، محمد ابراہیم ہے۔ لیکن سترہویں صدی کا اواخر اور اٹھارہویں صدی کا اوائل اردو شعر و ادب کے لیے بڑا ساز گار رہا۔ کیونکہ اسی زمانے میں اردو نے مغل دربار میں بار پایا۔ شاہانِ اودھ نے اس کی سرپرستی کی اور پرتگیزی، فرانسیسی اور انگریز نو واردین نے زبان ہندوستان یا ہندوستانی کی ترویج و اشاعت کے لیے سینٹ جارج کالج مدراس، فورٹ ولیم کالج کلکتہ اور دلی کالج قائم کیے۔ اس دوران بھی دکنی کا تسلسل قائم رہا۔ گو نظم کا رواج کم ہو گیا لیکن نثر میں یہ روایت برقرار رہی۔ بالآخر سرسید تحریک نے دکنی کے چلن کو بالکل موقوف کر دیا۔ جامعہ عثمانیہ کے قیام کے بعد تو یہ داستان پاستاں صرف 'بولی' کے روپ میں رہ گئی اور صرف و نحو و محاورہ و زبان کے اعتبار سے معیاری اردو دکنی سے اس حد تک مختلف ہوگئی کہ ''دکنی'' کو اردو کا بگڑا ہوا روپ سمجھا جانے لگا۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆☆☆

اردو زبان وادب کے ارتقامیں دکن کا حصہ

محمد مسعود عزیزی ندوی

رئیس مرکز احیاء الفکر الاسلامی مظفرآباد، سہارنپور(یوپی)

انسان کا شاید سب سے بڑا تخلیقی کارنامہ زبان ہے، ہم دراصل زبان کے ذریعہ اپنی ہستی کا اور اس رشتے کا اقرار کرتے ہیں جو انسان نے کائنات اور دوسرے انسانوں سے قائم کررکھے ہیں، انسان کی ترقی کا راز بھی بہت کچھ زبان میں پوشیدہ ہے کیونکہ علم کی قوت کا سہارا زبان بھی ہے، ہم روزمرہ جس زبان کا استعمال کرتے ہیں وہ اردو زبان ہے، جوایک شیریں زبان ہےاوراس کی اپنی کچھ خصوصیات ہیں:

اردو زبان کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں ہندی، فارسی اور عربی کی تمام آوازیں موجود ہیں، اردو کے حروفِ ہجا ان تینوں زبانوں کے حروفِ ہجا سے مل کر بنے ہیں۔ دوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس زبان میں دوسری زبانوں کے لفظوں اور محاوروں کو اپنانے کی بڑی صلاحیت ہے۔ تیسری خصوصیت یہ ہے کہ اردو کا رسم الخط شروع سے فارسی ہے۔

اردو زبان کو انیسویں صدی کی ابتداء تک ہندی، ہندوی، دہلوی، ریختہ، ہندوستانی، دکنی اور گجراتی جیسے مختلف ناموں سے یاد کیا جاتا تھا۔ اردو ترکی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی لشکر، سپاہی، کیمپ، خیمہ وغیرہ کے ہیں، عہدِ مغلیہ میں یہ لفظ انہی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ زبان کے معنی میں اس لفظ کا استعمال زیادہ پرانا نہیں، میرامن دہلوی، سرسید احمد خان اور سیداحمد دہلوی (مؤلف فرہنگِ آصفیہ) کا یہ دعوی کہ اردو زبان کی ابتداء شاہجہانی لشکر (اردو) سے ہوئی، اس لیے اس زبان کا نام بھی اردو پڑگیا، درست نہیں ہے، کیونکہ اٹھارہویں صدی عیسوی سے پیشتر کا کوئی شاعر ادیب اور تذکرہ نگار اس زبان کو ’’اردو‘‘ سے تعبیر نہیں کرتا۔

علمائے لسانیات نے زبانوں کو ان کی صوتی اور صرفی خصوصیات کی بنیاد پر مختلف خاندانوں میں تقسیم کیا ہے۔ سب سے بڑا خاندان آریائی زبانوں کا ہے، اس کے بعد منگول خاندان (چینی، جاپانی وغیرہ) کا نمبر آتا ہے، اور پھر سامی (عربی اور عبرانی وغیرہ) اور دراوڑی (تلگو، تامل، ملیالم، کنڑی) زبانوں کے خاندان ہیں، آریائی خاندان جو بنگال سے ناروے تک پھیلا ہوا ہے، کئی گھرانوں میں بٹ گیا ہے۔

ہندی کا علاقہ بہت وسیع تھا، یہ زبان ملتان سے پٹنہ تک بولی اور سمجھی جاتی تھی اور اس کی بہت سی مقامی بولیاں تھیں مثلاً برج بھاشا، کھڑی بولی، اودھی، بھوجپوری، قنوجی، ہریانوی وغیرہ، اور یہ زبان راجستھانی اور پنجابی سے بہت قریب تھی، مماثلت اور ہمسائیگی کے باعث ہم ہندی (مغربی اور مشرقی) پنجابی، راجستھانی اور سندھی وغیرہ کو آپس میں بہنیں کہہ سکتے ہیں۔

اردو کی ابتدا کے بارے میں ہم یقین سے فقط یہ کہہ سکتے ہیں کہ جب مغربی ہندی میں فارسی کا پیوند لگا تو یہ زبان وجود میں آئی، مغربی ہندی سے مراد وہ زبان ہے جو دہلی اور میرٹھ کے علاقے میں بولی جاتی تھی۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ غزنوی عہد میں لاہور اور ملتان وغیرہ میں بھی یہی زبان رائج تھی تو پھر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اردو کی داغ بیل اسی خطے میں پڑی۔

تیرہویں، چودھویں اور پندرہویں صدی کا زمانہ اردو زبان کی تشکیل کا دور ہے، اس دور میں بقول مولوی عبدالحق اردو کٹھالی میں پڑی گل رہی تھی، ہنوز سونا نہیں بنی تھی، اس دور میں امراء اور عمائدینِ سلطنت نے اردو کو منہ نہیں لگایا، ممکن ہے کہ یہ لوگ گھروں میں یہی زبان بولتے ہوں، مگر ان کی تحریر اور تصنیف کی زبان مدت تک فارسی ہی رہی، یہی زمانہ تصوف اور بھگتی کے عروج کا بھی ہے، اسی دور کی اردو کی خصوصیات میں ہندی الفاظ کی بہتات تھی، عربی اور فارسی کے الفاظ خال خال پائے جاتے تھے، فارسی اور عربی کی مذہبی اور صوفیانہ اصطلاحیں استعمال کی جاتی تھیں، مگر شعراء ہندی اور سنسکرت کے ٹھیٹ الفاظ اور عارفانہ اصطلاحیں بھی بڑی بے تکلفی سے استعمال کرتے تھے، شاعرانہ بحریں اور اصنافِ سخن سب ہندی کے تھے۔ اسی دور کی ایک غزل بھی امیر خسرو کے نام سے مشہور ہے، جس کا پہلا مصرعہ فارسی میں ہے اور دوسرا اردو میں ؎

زحالِ مسکیں مکن تغافل دورائے نیناں بنائے بتیاں
کہ تاب ہجراں نہ دارم اے جاں نہ لیہو کا ہے لگائے چھتیاں
شبانِ ہجراں دراز از زلف وروزِ وصلش چو عمر کوتاہ
سکھی پیا کو جو میں نہ دیکھوں تو کیسے کاٹوں اندھیری رتیاں

اردو زبان اور ادب نے ۳۰۰/سال تک جتنی ترقی دکن میں کی اس کی نظیر پورے ملک میں نہیں ملتی، اسی لیے دکن کے لوگ اگر یہ دعوی کرتے ہیں کہ ان کے پرکھوں نے اردو کو نکھارا، بنایا، سنوارا اور اس میں ادبی شان پیدا کی تو یہ دعوی بے بنیاد نہیں ہے۔

قطب شاہی (گولکنڈہ: ۱۵۱۸ء-۱۶۸۷ء) اور عادل شاہی (بیجاپور: ۱۴۸۹ء-۱۶۸۶ء) دور میں اردو کو دکن میں بہت فروغ ہوا، اور وہ ملک کی سب سے مقبول زبان بن گئی۔ جب دکن کی ریاستوں کو زوال آیا اور سلطنتِ مغلیہ کے دورِ عروج میں اورنگ زیب نے بیجاپور (۱۶۸۶ء) اور گولکنڈہ (۱۶۸۷ء) فتح کیا تو اورنگ آباد کی رونق بڑھ گئی، اردو کا اورنگ آبادی دور دراصل ایک درمیانی کڑی ہے، جو دکن کو شمالی ہندوستان سے ملاتی ہے، اورنگ آباد کے لوگوں کی زبان میں بھی یہ رنگ جھلکتا ہے جو دکنی تہذیب سے بھی متاثر ہے اور اردوئے معلیٰ سے بھی مماثلت رکھتی ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں شاہجہاں کا عہد بڑی اہمیت رکھتا ہے، اٹھارویں صدی کے تذکرہ نویسوں نے یہاں کی زبان کو ''اردوئے معلیٰ شاہجہاں آباد دہلی'' کا لقب دیا ہے۔

اردو دہلی اور اس کے نواح کے علاقے میں پیدا ہوئی اور علاء الدین خلجی، ملک کافور اور محمد تغلق کے حملوں کی وجہ سے دکن پہنچی، جہاں اس کو مختلف نام دئے گیے، مثلاً ہندی، ہندوی، گوجری، گجری، دکنی، مسلمانی، ترکماٹا، زبانِ اہل ہند، زبانِ دہلی، زبانِ ہندوستان وغیرہ، دکنی اسی اردو کا وہ قدیم روپ ہے، جو تیرہویں صدی عیسوی سے سترہویں صدی عیسوی تک دکن اور گجرات میں پروان چڑھتا رہا۔

۱۷۰۰ء میں جب دہلی میں ''ریختہ'' کے نام سے اردو شاعری کا احیاء ہوا، تو دہلی کی زبان دکنی سے بہ اعتبار صوتیات وصرف ونحووغیرہ کسی قدر مختلف ہوگئی اور معیاری اردو کہلائی، اوراس کی وہ شکل جودکن میں تھی ، اسے دکنی کہا جانے لگا، دکن کے اولین مراکز گجرات اور دولت آباد تھے، چنانچہ دکنی زبان ''گوجری'' اور ''گجری'' بھی کہلائی، ڈاکٹر چٹرجی گجری کی وجہِ تسمیہ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''دکنی کا نام گجری اس کی اصلیت اور مشابہت کا آئینہ دار ہے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے گوجر جنہوں نے پنجاب کے شہروں کو گجرات اور گوجرانوالہ کا نام دیا ، شمالی ہندی کی فوجوں کے ساتھ ہجرت کرکے دکن گیے ،توانہوں نے اپنے نام اور بولی کو کچھ دن کے لیے زندہ رکھا''۔

شوکت سبزواری کے خیال میں:

''دکنی ، گجری ، گجراتی دراصل وہی زبان ہے جو دلی سے ان علاقوں میں پہنچی ، البتہ ان میں مقامی الفاظ اورترکیبیں شامل ہوگئیں،دکنی اور گجراتی کے اس اختلاط کی وجہ یہ ہے کہ ''دکنی'' کا لسانی خطہ جنوب کی مختلف ریاستوں یعنی گجرات ،مہاراشٹر، آندھرا،میسور، تامل ناڈو کے موجودہ علاقوں پر مشتمل تھا، جہاں اردوزبان کا یہ روپ دکنی کی شکل میں ترقی کرتا رہا، جو بہ اعتبار صوتیات صرف ونحو،لغت وعروض معیاری اردو سے مختلف تھا،اس کی وجہ سے بعض علماء ''دکنی'' کواردو سے علیحدہ زبان تسلیم کرنے لگے''۔

ڈاکٹرمحی الدین قادری زور جنہوں نے ''دکنی'' کی بازیافت میں نمایاں حصہ لیا اورمحمود شیرانی ، جنہوں نے اردو کے آغاز کے بارے میں سب سے پہلے قلم اٹھایا ''دکنی اور پنجابی'' کی جزوی مماثلتوں کی بنا پر دکنی کا ماخذ پنجابی قرار دیتے ہیں، ڈاکٹر زور ہندوستانی صوتیات میں معیاری اردو کو کھڑی بولی سے مشتق اور ''دکنی'' کو ''پنجابی'' سے مشتق بتاتے ہیں،لیکن ڈاکٹر چٹرجی، ڈاکٹرژول بلاک اورڈاکٹرمسعود حسین خان کی تحقیقات کی رو سے ''دکنی'' معیاری اردو کا قدیم روپ ہے، جس کا ہیولیٰ ،نواحِ دہلی کی بولیوں ، کھڑی ، ہریانی اورمیواتی سے تیار ہوا، دکن کا علاقہ ایک آریائی زبان مراٹھی سے بھی گھرا ہوا ہے، اس لیے ''دکنی'' نے مراٹھی اوراس سے قبل مہاراشٹری پراکرت کا خاصا اثر قبول کیا، اس کے علاوہ دراوڑی خاندان کی زبانوں ، تامل ،تلنگی ، ملیالم ،کنٹری سے گھری ہونے کی وجہ سے تلنگی ، کنٹری اور تامل کے بعض الفاظ بھی دکنی میں شامل ہوگیے ،لیکن ان زبانوں کے اثرات سے اردو قواعد محفوظ رہے۔

دکن میں اردو کی ابتداء علاء الدین خلجی اورملک کافور کے حملوں سے ہوئی (۱۳۰۲-۱۳۱۳ء) مالوہ، اجین اورمنڈو کو فتح کرنے کے بعد شاہی لشکر نے دکن کا رخ کیا اور دیوگیر (دولت آباد) اور وارنگل پر قبضہ کرتا ہوا راس کماری تک پہنچ گیا،خلجیوں کے بعد جونا خان نے اپنے باپ غیاث الدین تغلق کے عہد میں (۱۳۲۱ء) دیوگیر، وارنگل اور بیدر کودوبارہ فتح کیا اوروہاں اپنے نائب متعین کردیئے، پھر جب جونا خان سلطان محمد تغلق کے نام سے دہلی کے تخت پر بیٹھا تواس نے ۱۳۲۷ء میں اپنا پایہ تخت دولت آباد منتقل کردیا اور دہلی کے امراء اورعمال ،اہلِ حرفہ اورتجار، علماء وفضلا اور شاہی لشکر کو ترکِ وطن کرکے

دولت آباد میں سکونت اختیار کرنا پڑی، دوسال بعد بادشاہ خودتو دہلی واپس چلا گیا مگر دہلی کے بکثرت باشندے دکن ہی میں آباد ہوگیے، اس طرح دکن میں اردو کی داغ بیل پڑی، دکن میں اردو کے فروغ کا ایک سبب یہ ہوا کہ حسن گنگوہی بہمنی نے دکنی امراء کی مدد سے ۱۳۴۷ء میں دولت آباد فتح کرلیا اور دہلی سے رشتہ توڑ کر خود مختار بہمنی سلطنت کی بنیاد رکھی۔

(دکن میں اردو از نصیرالدین ہاشمی صفحہ ۲۴ لاہور ۱۹۴۰)

بہمنی فرمانرواؤں نے اردو کو دفتروں کی سرکاری زبان قرار دیا، سید عین الدین گنج العلم حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے ایک سو مریدوں کے ہمراہ اسی زمانے میں دکن آئے، خواجہ محمد حسین گیسودراز نے بھی اسی عہد میں گلبرگہ میں سکونت اختیار کی، بہمنی دور کے اردو ادیبوں میں سلطان احمد شاہ ثالث (۱۴۶۳ء-۱۴۸۲ء) کا درباری شاعر نظامی قابلِ ذکر ہے، ان سے ایک مثنوی ''کدم وپدم'' منسوب ہے۔

دکن پر ایرانی تہذیب کا اثر ہمایوں بہمنی اور محمود شاہ بہمنی کے وزیر خواجہ محمود گاواں کے زمانے ہی میں بڑھنے لگا تھا، محمود گاواں بڑا صاحبِ فضل وکمال تھا اور علم وفن کا قدر داں تھا، ایرانی امیروں اور دانشوروں کو وہ خاص طور پر نوازتا تھا کیونکہ وہ خود بھی ایرانی تھا، چنانچہ گولکنڈہ اور بیجاپور کی فیاضیوں اور علم پروریوں کا شہرہ سن سن کر ایرانی علماء، شعراء اور امراء دکن میں آتے اور دولت اور عزت سے سرفراز ہوتے، دکنی شاعروں نے فارسی کی تقلید میں اردو میں غزل کی ابتداء کی ،اردو کی سب سے قدیم غزل دکنی شاعر مشتاق کی ہے، جو سلطان محمد شاہ بہمنی (وفات ۱۴۸۲ء) کے آخری زمانہ میں تھا، غزل کے دوشعر یہ ہیں:

تجھ دیکھتے دل تو گیا ہور بیوا پر بے کل گھڑی
دیکھے تو ہے جیؤ کے اوپر نیں دیکھے تو کل گھڑی
آبِ حیات اور لب تیرے جاں بخش وجاں پرور آہے
مشتاق بوسے سوں پیا امرت بھری او کل گھڑی

(دکنی ادب کی تاریخ: از ڈاکٹر محی الدین زور کراچی صفحہ ۱۶)

اگر اردو زبان وادب کے ارتقاء پر نظر ڈالیں تو یہ حقیقت معلوم ہوتی ہے کہ تاریخی اعتبار سے جنوبی ہند میں اردو زبان نے پہلے اپنے سفر کا آغاز کیا، جنوبی ہند کے علاقوں گجرات اور دکن میں جس وقت اردو شاعری کا آغاز ہوا، اس وقت شمالی ہند میں اس کے کوئی آثار موجود نہ تھے، دکن میں اردو شاعری کا آغاز بہمنی عہد (۱۳۴۷-۱۵۲۷) میں ہو چکا تھا، اس عہد کی ادبی تاریخ، تخلیق کاروں کے سوانح اور بیش تر ادب پارے ابلق ایام کے سموں کی گرد میں اوجھل ہو چکے ہیں، بہمنی عہد میں تخلیق ہونے والے اردو زبان کی شاعری کے اولین نمونے جن کی مدد سے اردو شاعری کے ارتقا کی حقیقی صورت حال کے بارے میں آگاہی ملتی ہے ان کی تعداد بہت کم ہے، دکن میں اس زبان سے تخلیق ہونے والی شاعری کے ابتدائی نمونے اس حقیقت کے غماز ہیں کہ اردو شاعری کا ہیولیٰ یہیں سے اٹھا تھا، خواہ اسے کسی نام سے پکارا جائے یہ اردو شاعری کا نقشِ اول ہی سمجھا جاسکتا ہے، مثال کے طور پر گجرات میں اردو شاعری کے اولین نمونوں کو گجری یا گجراتی زبان کی شاعری کے نمونے قرار دیا جاسکتا ہے، اگرچہ ان کی تعداد بہت کم ہے لیکن اپنی اصلیت کے اعتبار سے یہی اردو شاعری کی ابتدائی شکل ہیں، بہمنی دور میں دکن کو اہم تجارتی اور علمی مرکز کی حیثیت حاصل رہی، تاہم اس عہد کی کوئی قابلِ ذکر تصنیف اب

دستیاب نہیں ، اس عہد کے ایک ممتاز ادیب عین الدین گنج العلم کا نام مختلف تذکروں میں ملتا ہے، لیکن اس کی کسی ایسی تصنیف کا سراغ نہیں مل سکا جو زبان دکنی میں ہو، اس دور کی اولین اور اہم ترین تصنیف جس تک ادب کے طلباء کی رسائی ہے وہ فخر الدین نظامی کی تصنیف ''کدم راؤ پدم راؤ'' ہے ، مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' بہمنی خاندان کے نویں بادشاہ سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عرصۂ اقتدار (۱۴۲۱-۱۴۳۴) میں لکھی گئی، اس مثنوی کا اہم ترین موضوع سلطان احمد شاہ ولی بہمنی کے عہدِ حکومت کے اہم واقعات اور معاملاتِ سلطنت ہیں، اس مثنوی میں سیاسی نشیب وفراز ، معاشرتی زندگی کے ارتعاشات اور سماجی مسائل کے بارے میں تاریخ کے مسلسل عمل کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے بڑی مہارت سے لفظی مرقع نگاری کی گئی ہے، اس میں صدآفرینی کی جو کیفیت ہے اس کا کرشمہ دامنِ دل کھینچتا ہے، اس عہد کے حالات نے تہذیبی اور ثقافتی زندگی اور فنونِ لطیفہ پر جو اثرات مرتب کیے، ان کے بارے میں یہ مثنوی ایک اہم ماخذ ہے ۔

شہنشہ بڑا شاہ احمد کنوار
پرت پال ، سنسار، کرتا ادھار
دھنیں تاج کا کون راجا ابھنگ
کنور شاہ کا شاہ احمد بھجنگ
لقب شہ علی آل بہمن ولی
ولی تھی بہت بدھ تد آگلی

اس مثنوی میں جو زبان استعمال کی گئی ہے، وہ چھ سوسال قدیم ہے، اتنی قدیم زبان کے ذخیرۂ الفاظ کو آج کے دور میں سمجھنا بلاشبہ ایک کٹھن مرحلہ ہے، اس مثنوی میں اسلوب کے دو پہلو قابلِ توجہ ہیں، ایک تو یہ کہ تخلیق کار نے ''ہندوی اثرات'' کو اپنے اسلوب میں پوری آب وتاب سے جگہ دی ہے۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ اس مثنوی میں فارسی زبان اور اس کا لہجہ واضح طور پر مؤثر دکھائی دیتا ہے، اس طرح اسلوب میں ایک دھنک رنگ کیفیت سامنے آتی ہے ، لسانی ارتقاء ایک مسلسل عمل ہے، گردشِ ماہ وسال کے نتیجے میں زبانیں بھی اپنے ذخیرۂ الفاظ میں ردوبدل اور ترک وانتخاب کے مرحلے سے گزرتی رہتی ہیں، نئے نئے خیالات، متنوع اسالیب اور نئی زبانوں کے الفاظ کے اشتراکِ عمل میں ایک قوس قزح کا منظر نامہ مرتب ہوتا ہے، لسانی ارتقا کی یہ کیفیت جہاں تخلیق کار کی ذاتی دلچسپی کو ظاہر کرتی ہے، وہاں اس کے مطالعہ سے اقتضائے وقت کے مطابق عصری آگہی کے پہلو بھی سامنے آتے ہیں، مثنوی کے تخلیق کار نے اپنا پورا نام اور تخلص اپنی تخلیق میں متعدد مقامات پر لکھا ہے ۔

مجھے ناؤں ہے قطب دیں قادری
تخلص سو فیروز ہے بے دری

بہمنی دور میں جو ادب تخلیق ہوا، اس میں پائے جانیوالے درجِ ذیل تین رجحانات قابلِ توجہ ہیں، جن کی عکاسی اس عہد کے اہم تخلیق کاروں کے اسلوب میں ہوتی ہے:

۱- زیادہ تر تخلیق کاروں نے شعوری غور وخوض سے یہ کوشش کی کہ عجائباتِ فطرت، عبرت آموز واقعات، لوک داستانوں ، قصوں ،کہانیوں ، انوکھی باتوں یا دلچسپ موضوعات کو پرلطف انداز میں اشعار کے قالب میں ڈھال کر قارئینِ ادب کے لیے سکونِ قلب اور مسرتِ فراواں کے مواقع پیدا کیے جائیں۔

۲- بھمنی عہد کے اکثر تخلیق کاروں کی توجہ مذہبی اقدار وروایات ،تاریخی واقعات، اور سبق آموز حکایات کو شاعری میں سمونے پر مرکوز رہی۔

۳- بھمنی عہد کے تخلیق کاروں کے اسلوب میں مذہب سے وابستگی کا عنصر غالب رہا،انھوں نے مقدور بھر کوشش کی کہ تصوف اور مذہبی رشد وہدایت کے اہم موضوعات کو شاعری کے وسیلے سے قارئین تک پہنچایا جائے، وہ سمجھتے تھے کہ شاعری ہی وہ واحد ذریعہ ہے جو قارئینِ ادب تک ان کے خیالات کی ترسیل پر قادر ہے،تخلیقِ فن کے لمحوں میں بھمنی دور کے تخلیق کاروں نے ادب کے وسیلے سے مسرت وشادمانی کے حصول کو اپنی اولین ترجیح قرار دیا، ان کے ادب پاروں میں ان کی شخصیت کے اہم پہلو پوری طرح سماگیے ہیں، ان کے شخصی وقار نے تخلیقی عمل کو بھی اسی حسین رنگ میں رنگ لیا ہے،اس عہد کی مشہور اور مقبول مثنوی ''کدم راؤ پدم راؤ'' میں تخلیق کار کے اسلوب میں پائے جانے والے رجحانات کی چند مثالیں پیش ہیں،ان کے مطالعہ سے لسانی ارتقا کے مختلف مدارج کی تفہیم میں مدد مل سکتی ہے ۔

سنیا تھا کہ ناری دہرے بہت چھند
سومیں آج دیٹھا تری چھند پند
بڑے ساچ کہہ کر گیے بول اچوک
دودھا دود کا چھاچھا پیوئے پھوک
مجھے مارناں مار کے گھال دے
ولے آج اکھر مار نیکال دے
جوکچ کل کرنا سو توں آج کر
نہ گھال آج کا کام توں کال پر
بھلائے کوں بھلائی کرے کچھ نہ ہوئے
برے کوں بھلائی کرے ہوئے تو ہوئے

نظامی کی ایک اور مثنوی ''خوف نامہ'' ہے، اس مثنوی میں تخلیق کار کے اسلوب میں ارتقاء دکھائی دیتا ہے، پہلی مثنوی کی نسبت اس دوسری مثنوی میں نظامی نے سادہ، سلیس اور صاف لہجہ اپنایا ہے، اس مثنوی میں شاعر نے حیات بعدالموت کے مسائل کو موضوع بنایا ہے، انھوں نے قاری کو روزِ محشر کے بارے میں مذہبی روایات سے مطلع کیا ہے، قیامت کے دن اعمال کی بنا پر جزاء اور سزا کا نہایت مؤثر اور دل نشیں انداز میں ذکر کیا گیا ہے،شاعر نے اپنے ناصحانہ اسلوب کے ذریعہ قاری کو اخلاقیات کا درس دیا ہے،اس مثنوی میں تعلیم کو اولین ترجیح سمجھتے ہوئے شاعر نے افراد کے اعمال کی اصلاح کو اپنا مطمحِ نظر ٹھہرایا ہے، اس مثنوی میں تفریح کے بجائے تعلیم پر توجہ مرکوز کی گئی ہے۔

حسن شوقی کی مثنوی ''فتح نامہ نظام شاہ'' (۱۵۶۴ء)اور اشرف بیابانی (۱۴۵۹-۱۵۲۸) کی مثنوی ''نوسرہا''اس عہد میں یہ زبان وبیان کی ارتقائی کیفیت کی مظہر تصانیف ہیں، اشرف بیابانی اپنی تصانیف ''واحد باری'' اور'' قصہ آخرالزماں'' کی شاعری میں استعمال ہونے والی زبان کو ھندی یا ھندوی کا نام دیتا ہے۔

ایک ایک بول یہ موزوں آن
تقریر ہندی سب بکھاں

تخلیقی اعتبار سے دیکھیں تو تخلیقِ ادب کے یہ معائر جہاں نئے حقائق کے مظہر ہیں وہاں ان کی وجہ سے جمود کا خاتمہ

ہوا اور نیا لسانی نظام وجود میں آنے کے امکانات روشن ہوتے چلے گیے ،اسی عہد کے ایک شاعر میراں جی شمس العشاق (۱۴۹۴) نے اپنی شاعری میں تصوف کے موضوع پر نہایت دلنشیں انداز میں اپنے اشہبِ قلم کی جولانیاں دکھائی ہیں، بہمنی عہد میں ان شعراء کی کاوشوں سے اردو کو پورے دکن میں زبردست پزیرائی نصیب ہوئی ، ماہرینِ لسانیات کا خیال ہے کہ بہمنی عہد میں تخلیق ادب کے سلسلے میں پورے دکن میں صرف اردو ہی واحد مشترک زبان تھی جس میں تخلیق کار پرورشِ لوح وقلم میں مصروف تھے، دکن کے اہل قلم نے اردو نثر میں بھی سب سے پہلے اپنے تخلیقی سفر کا آغاز کیا، اخلاق وتصوف کے موضوعات پر اس عہد میں چند رسائل منصۂ شہود پر آئے ، ان رسائل کے مصنف شیخ گنج العلم ہیں، یہ رسائل بہمنی خاندان کے عہد میں دکن کی سرزمین سے تصنیف ہوئے۔

زبانِ اردو کی تاریخ کو مکمل طور پر سمجھنے کے لیے اس کو ادوار میں تقسیم کرنا مناسب ہے، یہ ادوار حسب ذیل ہیں:

دورِ موجدین: (۱۱۹۳ء-۱۳۴۷ء) یعنی کھڑی بولی کا ادب ، کھڑی بولی مسلمانوں کی آمد سے پہلے لسانی اعتبار سے پسماندہ زبان تھی، مسلمانوں کی آمد کے بعد ایک مدت تک وہ صرف روزانہ کاروبار اور عام بول چال کی زبان رہی۔

دورِ متقدمین: (۱۳۴۷ء-۱۷۵۰ء) دکن کا اردو ادب، جس کو ادبی نظم ونثر کے نمونے پیش کرنے میں اولیت حاصل ہے۔

دورِ متأخرین: (۱۸۰۰ء-۱۸۵۷ء)

دورِ جدید: (۱۸۵۷ء-۱۹۳۵ء)

دورِ حاضر: (۱۹۳۵ء-۲۰۱۶ء)

تیرہویں صدی سے سترہویں صدی تک دکنی ادب کے کئی اہم کارنامے منظر عام پر آئے ، دکنی میں تصنیف وتالیف کا سلسلہ ۱۸۶۷ء تک برقرار رہا، چنانچہ ۱۸۶۷ء میں حیدرآباد کے ایک صوفی فقیر اللہ شاہ حیدر نے نہال چند لاہوری کی تصنیف ''بکاولی'' کے مقابل میں اپنی تصنیف ''تناولی'' پیش کی، باقر آگاہ اپنی مثنوی ''گلزارِ عشق'' کے دیباچے میں جو ۱۷۹۶ء میں لکھی گئی ، دکنی پر کیے ہوئے اعتراضات کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مقصود اس تمہید سے یہ ہے کہ اکثر جاہلان وہرزہ سرایاں زبانِ دکنی پر اعتراض اور ''گلشن عشق''، ''علی نامہ'' کے پڑھنے سے احتراز کرتے ہیں اور جہل مرکب سے نہیں جانتے کہ جب تک ریاست سلاطین دکن کی قائم تھی، زبان ان کی درمیان ان کے خوب رائج تھی، اور طعنِ شماتت سے سالم تھی ، اکثر شعراء وہاں کے ابن نشاطی ، فراقی ، شوقی، خوشنود، غواصی، ایاغی ، ہاشمی ، شغلی ، بحری ، نصرتی ،مہتاب وغیرہم نے اپنی زبان میں بے حساب قصائد، غزلیات، مثنویات اور قطعات رقم کیے اور دادِ سخنوری کا دئے''۔

دکنی کی ترقی کا اندازہ لگانے کے لیے دکنی ادب کی تاریخ کو ان چار ادوار میں منقسم کیا جاتا ہے:

پہلا دور : گجرات میں دکنی یا قدیم اردو کا چلن۔

دوسرا دور : ۱۳۲۴ء سے ۱۶۸۶ء تک، علاء الدین خلجی اور محمد بن تغلق کے حملوں کے بعد بہمینہ سلطنت کے قیام

اور بہمینہ سلطنت کے سقوط کے بعد گولکنڈہ ، بیجا پور اور احمد نگر کے شمالی ہند میں انضمام تک۔

تیسرا دور : اورنگ زیب کے عہد میں دکنی کا اہم مرکز اورنگ آباد تھا۔

چوتھا دور : دورِ آصفی ،مرکز گجرات میں اس زبان کی سرپرستی حضرت عین الدین گنج العلم ،شاہ علی جیوگام دھنی ، بہاء الدین باجن ، شیخ خوب محمد چشتی ، جیسے علماء وصوفیا نے کی ، شاہ علی جیوگام دھنی نے اپنی یادگار ایک اردو دیوان ''جواہر اسرار اللہ'' چھوڑا ، شیخ خوب محمد نے اپنے مرشد بہاء الدین باجن کے کلام کی شرح ''خوب ترنگ'' کے نام سے لکھی ، مابعد کے زمانے میں محمد امین گجراتی کی تصنیف ''یوسف زلیخا'' قدیم اردو کی اہم تصنیف ہے ، سید علی جیوگام دھنی کے کلام کو ان کے ایک شاگرد نے ترتیب دیا ، اس میں ان کی شاعری کے متعلق لکھتا ہے : '' در بیانِ توحید و اسرار با الفاظ گجری بطریق فرمودہ'' یہ نام گجری اور گوجری دکنی کے لیے اس دور میں خاصہ مقبول رہا ، چنانچہ بیجا پور کے مشہور صوفی شاہ برہان الدین جانم اپنی تصانیف ''کلمۃ الحقائق'' اور ''حجۃ البقاء'' میں دکنی کو گجری کے ہی نام سے یاد کرتے ہیں۔

بہمنی دور کے مشہور شعراء اور ادباء جن کے کارنامے منظر عام پر آ چکے ہیں مندرجہ ذیل ہیں:

۱- حضرت عین الدین گنج العلم گجرات سے دکن تشریف لائے۔
۲- سید محمد حسینی بندہ نواز گیسودراز۔
۳- حضرت اکبر حسینی۔
۴- حضرت عبداللہ حسینی
۵- نظامی - مصنف کدم راو پدم راؤ
۶- امیر الدین شاہ میراں جی شمس العشاق
۷- فیروز مصنف پرت نامہ یا توصیف نامہ میراں محی الدین
۸- اشرف مصنف نوسرہار

قلی قطب شاہ کے دربار میں اس عہد کے متعدد نامور ادیب ، شاعر اور دانش ور موجود تھے ، ان میں میر محمد مومن ، ملا وجہی ، اور غواصی کے نام قابلِ ذکر ہیں ، سلطان محمد قلی قطب شاہ نے جولسانی تجربہ کیا ، اس کا اہم ترین پہلو یہ ہے کہ اس کے تخلیقی عمل میں کئی تہذیبوں کا سنگم دکھائی دیتا ہے ، ایک زیرک تخلیق کار کی حیثیت سے اس نے ایرانی ، عربی اور مقامی تہذیب وثقافت کے درخشاں پہلوؤں کو اپنے فکر وفن کی اساس بنایا ، اس کے تخلیقی عمل میں فارسی شاعری کی روایت اور اسالیب پر توجہ مرکوز رہی ، اس نے علمِ عروض ، صنائع بدائع بالخصوص تشبیہات ، استعارات اور تلمیحات کے سلسلے میں بالعموم فارسی زبان کی روایات کو پیشِ نظر رکھا ہے ، اس کی شاعری میں اس عہد کی تہذیب ومعاشرت کی حقیقی تصویر جلوہ گر ہے ، جہاں تک حسن ورومان اور عشق ومحبت کے موضوعات کا تعلق ہے ، قلی قطب شاہ نے یہاں ہندی روایت کو پیش نظر رکھا ہے ، اس نے اظہارِ محبت اور پیمانِ وفا باندھنے کے سلسلے میں ہندی روایت ہی کو اپنی شاعری میں جگہ دی ہے ، عشق کی ہندی روایت میں محبت کا اظہار سب سے پہلے عورت کی جانب سے ہوتا ہے ، اس کے بعد وہ محبت کے دشتِ پرخار میں جب آبلہ پا مسافر کی طرح صدائے جرس کی جستجو میں بھٹک کر سرابوں اور سکوت کے صحراء میں آہ وفغاں کرتی ہے تو

یہ بات قاری کے دل میں اتر جاتی ہے، حریف اور رقیب کے ستم تو صرف بیان کیے جا سکتے ہیں، مگر عاشق کی کج ادائی اور بے وفائی خون کے آنسو رلاتی ہے۔

بہمنی دور کے بعد قطب شاہی دور میں اردو زبان وادب کے فروغ کا سلسلہ جاری رہا، جنوبی ہند میں اردو زبان وادب کو مضبوط و مستحکم بنیادوں پر استوار کرنے میں اس عہد کے تخلیق کاروں نے بڑی محنت اور جگر کاوی کا ثبوت دیا، اس عہد کے ادیبوں نے تاریخی شعور کو بروئے کار لاتے ہوئے قارئینِ ادب کو اخلاص ومروت کا پیغام دیا۔

اس عہد کے اہم تخلیق کاروں میں باکمال تخلیق کار ملا خیالی، صاحبِ اسلوب سید محمود، مشہور شاعر فیروز، نامور ادیب ملا وجہی، سلطان محمد قطب شاہ، قادر الکلام شاعر ملا غواصی اور سلطان عبداللہ قطب شاہ، عظیم فن کار ابن نشاطی، استادِ سخن طبعی، عظیم شاعر ولی دکنی جیسے اساطینِ علم وادب شمار کیے جاتے ہیں۔

مختلف ادوار میں گولکنڈہ کے جن شعراء نے اپنی تخلیقی فعالیت سے اردو ادب کی ثروت میں اضافہ کیا ان میں قطبی، شاہ سلطان، جنیدی، ابن نشاطی، میراں جی، میراں یعقوب، بلاقی، طبعی، محبّ، کبیر، اولیاء، غلام علی، سیوک، فائز، لطیف، شاہ راجو، فتاحی، افضل اور شاہی کے نام قابل ذکر ہیں۔

مغلوں نے ۱۶۸۵ء میں بیجاپور اور ۱۶۵۸ء میں گولکنڈہ کو فتح کرلیا تو جغرافیائی تبدیلیوں کے ساتھ ساتھ تہذیبی، ثقافتی، لسانی، معاشرتی اور سماجی تبدیلیوں کا ایک نیا سلسلہ شروع ہوگیا جس نے سلطنت میں ہر شعبۂ زندگی کو متأثر کیا، مغلیہ عہد میں دکن میں جو ادب تخلیق ہوا وہ اردو زبان کے ارتقاء کا مظہر ہے، اس عرصہ میں جو مثنویاں لکھی گئیں، ان میں شعراء کی بالعموم تصوف، اخلاقیات، حسن ورومان اور رزم اور بزم کی شان دل ربائی قاری کو مسحور کردیتی ہے، مثال کے طور پر سراج اورنگ آبادی کی مثنوی ''بوستانِ خیال'' موضوع اور اسلوب کی دل کشی کے لحاظ سے شمالی ہند میں تخلیق ہونے والی مثنویوں سے کسی طرح کم نہیں، سراج اورنگ آبادی نے مثنوی بوستانِ خیال میں تخیل کی جولانیاں دکھاتے ہوئے اپنے کمالِ فن کو ادبی تخلیق میں احسن طریقے سے سمو دیا ہے، قاری اسے پڑھ کر حظ اٹھاتا ہے۔

مذکورہ بالا سطور سے بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اردو زبان وادب کے ارتقاء میں دکن کا کیا حصہ رہا ہے، بہت سے قلمکاروں نے اس موضوع پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے اور اپنی اپنی تخلیقات ومعلومات سے ادب سے دلچسپی رکھنے والے لوگوں کو اچھا مواد فراہم کیا ہے۔

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

نوٹ: اس مضمون کی تیاری میں راقم نے سید شہزاد ناصر کے مضمون ''اردو زبان کی ابتداء اور اس کا ارتقاء'' انسائیکلوپیڈیا کے ایک مضمون '' اردو زبان وادب'' روزنامہ نوائے وقت میں شائع شدہ مہر محمد خالد کے مضمون ''اردو کے فروغ میں شعراء کا کردار'' اور غلام شبیر رانا کے مضمون ''دکن میں اردو ادب کا ارتقاء'' سے استفادہ کیا ہے، اللہ تعالی تمام مضمون نگاروں کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ (آمین)

تعارفِ کتاب

فضیل ناصری کا مجموعۂ کلام

''آؤ کہ لہو رو لیں''

پروفیسر محسن عثمانی ندوی

''آؤ کہ لہو رولیں'' شاعر فضیل ناصری (دیوبند میں استاد اور اردو کے شاعر اور نقاد) کا اشک ریز اور غم انگیز دیوان ہے۔ اس دیوان پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش اس شخص سے کی گئی ہے جس کا کام ہی نثر میں مرثیہ لکھنا رہ گیا ہے، کبھی اپنے وطن کا مرثیہ اور کبھی عالمِ اسلام کا مرثیہ، کبھی مسلمانوں پر عالمِ کرب وبلا کا مرثیہ، کبھی اپنے بے بصیرت قائدین کا مرثیہ، کبھی عوام کی بے عملی کا مرثیہ۔ مقدمہ نگار کو جب اس منظوم کتاب کا مسودہ ملا تو اسے بغیر کسی انکساری کے محسوس ہوا کہ شاعر نے مقدمہ لکھنے کے لیے صحیح شخص کا انتخاب کیا ہے اور اب وہ وقت آگیا ہے کہ شاعر اور مقدمہ نگار مل کر آہ وزاری کریں۔

آ عندلیب مل کے کریں آہ وزاریاں
تو ہائے گل پکار میں چلاؤں ہائے دل

مقدمہ نگار کا یہ دعوی کہ کتاب پر مقدمہ لکھنے کے لیے صحیح شخص کا انتخاب کیا گیا ہے محض دعوی نہیں، جو لوگ کتاب ہی نہیں پڑھتے اور خطِ کتاب سے نیچے زندگی گذارتے ہیں ان کی بات اور ہے لیکن جو لوگ پرنٹ میڈیا پر نظر رکھتے ہیں اور مطبوعات کی دنیا سے واقف ہیں، وہ جانتے ہیں کہ راقم کے قلمِ حسرت رقم سے بے شمار چشمۂ غم پھوٹ چکے ہیں۔ صرف حالاتِ حاضرہ کے موضوع پر کتابوں کے عنوانات پر نظر ڈالیے:

۱۔ شام جل رہا ہے
۲۔ شام لہولہو
۳۔ شام کی صبحِ درخشاں کب؟
۴۔ مصر شام اور فلسطین۔ خون سے لالہ زار
۵۔ سفینۂ غم۔ مشرقِ وسطی لہولہان
۶۔ ترکی، مصر، سعودی عرب اور اخوان
۷۔ سقوطِ شام
۸۔ حرم کا پیر۔ اور کلیسا سے آشنائی
۹۔ عرب دنیا کے انقلابات
۱۰۔ دے مجھ کو زباں اور
۱۱۔ حالات بدل سکتے ہیں
۱۲۔ مصر میں اخوان کا قتلِ عام
۱۳۔ ۲۰۱۴ کے الکشن کے نتائج اور مسلمانوں کی آئندہ کی حکمت عملی
۱۴۔ ملک میں حالات کا نیا رخ اور امتِ مسلمہ کی ذمہ داریاں

۱۵۔ قافلۂ حجاز میں ایک حسین بھی نہیں

خودستائی اور درازنفسی کوئی اچھی عادت نہیں لیکن یہ بھی تحدیثِ نعمت ہے کہ اللہ نے اسلام اور عالمِ اسلام کے غم سے نوازا ہے اور کبھی خود سے سوال کرنے کا دل چاہتا ہے :

''کس لیے بخشی ہے اس نے در کی دربانی مجھے۔''

اکیسویں صدی کے شروع ہونے کے ایک دو برسوں کے بعد گجرات سے لے کر افغانستان اور پھر عراق تک مسلسل ایسے واقعات پیش آئے کہ دل کو سکون کبھی حاصل نہ ہوسکا ، ایک اضطراب اور مسلسل اضطراب ، اندوہِ غم اور بلا انقطاع اندوہِ غم کا عالم طاری رہا، اور یہی حالات تھے جس نے اس کوتاہ دست کو مسلسل دل سوزی اور آتش نوائی میں مشغول رکھا ۔ راقمِ سطور کو شاعری اور سخن وری کا ہنر نہیں آتا ہے ۔ جناب فضیل ناصری کو یہ ہنر آتا ہے ۔انھوں نے اسی غمِ دل کو جو مقدمہ نگار کو بھی کسی درجہ میں حاصل ہے ،شعر کے بہترین قالب میں ڈھال دیا ہے۔انھیں کلیم عاجزؔ کی زبان میں یہ کہنے کا حق حاصل ہے ۔

جہاں غم ملا اٹھایا پھر اسے غزل میں ڈھالا
یہی دردِ سر خریدا یہی روگ ہم نے پالا
ترے ہاتھ سے ملی ہے مجھے آنسوؤں کی مالا
تری زلف ہو دو گونا ترا حسن ہو دوبالا
میں ہرے بھرے چمن میں وہ شکستہ شاخِ گل ہوں
نہ خزاں نے جس کو تھاما نہ بہار نے سنبھالا

کلیم عاجزؔ پر غم کا پہاڑ ٹوٹا تھا، اتنا بڑا پہاڑ جو میر تقی میر پر بھی نہیں ٹوٹا تھا۔کلیم عاجزؔ کے کلام میں غم کی وہ آگ ہے جس کی مثال اردو شاعری پیش کرنے سے قاصر ہے۔ان ہی کا شعر ہے۔وہ خود کہتے ہیں ۔

اس قدر سوز کہاں اور کسی ساز میں ہے
کون یہ نغمہ سرا میرؔ کے انداز میں ہے

....

آرام سے چھپ جاتی ہے پردہ میں غزل کے
وہ آگ جو سینہ میں دبائے نہ بنے ہے

جناب فضیل ناصری کہتے ہیں کہ'' شاعری غم واندوہ میں جنم لیتی ہے اور تنگی فضا میں نمو پاتی ہے، جو شاعر جس قدر ستم سیدہ اور آفت زدہ ہوگا اس کے کلام میں اسی درجہ کا زور اور شباب ہوگا۔غمِ جاناں ہو یا غمِ دوراں شاعری کے لیے اس کا وجود تحریک اور نقطہ آغاز ہے۔ یہ دونوں مہمیز کا کام کرتے ہیں'' ۲۰۱۷ کا الکشن ہوا اور یوپی میں اسمبلی کے الکشن کے نتائج سامنے آئے تو دل شکستگی کے عالم میں فضیل ناصری کی زبان نغمہ سرا ہوگئی۔ بعینہ اسی طرح جب ۲۰۱۴ میں پارلیامنٹ کے الکشن میں اسلام دشمنوں کی فتح ہوئی تو اس مقدمہ نگار کے قلم سے نثر میں مضامین شائع ہوئے جن کا مجموعہ ہدی پبلکیشن حیدرابادنے کتابچہ کی شکل میں شائع کیا۔کوئی بتائے کہ اگر'' آؤ کہ لہو رولیں'' کے لیے اس مقدمہ نگار کو تکلیف دی گئی اور مقدمہ نگار نے یہ لکھ دیا کہ انتخاب صحیح کیا گیا تو یہ خودستائی نہیں بلکہ اعترافِ حقیقت ہے۔

جہاں تک شاعری کا تعلق ہے تو مقدمہ نگار کو اعتراف ہے کہ ادبی اور شعری ذوق کے باوصف یہ مقدمہ نگار اس کی گردتک تک نہیں پہونچ سکتا ہے۔حالات سے متاثر ہونا اور اظہارِ خیال کرنا ایک باشعور دردمند صاحبِ قلم کا فریضہ ہے اور شاعر تو وہی ہے جو حالات کا شعور رکھتا ہواور احساس کی

شدت اسے فن کا شہپارہ تیار کرنے پر مجبور کردے۔اور حدیث نبوی کے اعتبار سے وہ مسلمان مسلمان نہیں ہے جو امت کا غم خوار نہ ہو۔ جمال الدین افغانی جب مرض الموت میں مبتلا تھے اور بولنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیے تھے تو انہوں نے کاغذ پر دولفظ لکھے تھے ''امتی امتی''، یعنی میری قوم میری قوم۔اسی طرح دولفظ اور ہیں ''امتی امتی''، جن کی نسبت حضورِ اکرم (ﷺ) کی طرف ہے۔کسی بھی شخص کے لیے یہ بڑے اعزاز کی بات ہے کہ اسے اس آتش کدۂ غم کی چنگاری نصیب ہو جائے۔

خرید سکتے ہیں دنیا میں عشرتِ پرویز
خدا کی دین ہے سرمایۂ غمِ فرہاد

فضیل احمد ناصری نے حالاتِ حاضرہ پر جو نظمیں کہی ہیں ان کے مجموعہ کا نام ''آؤ کہ لہو رولیں'' رکھا ہے۔یہ نام خود بہت شاعرانہ اور ادیبانہ ہے۔وہ رگوں میں دوڑنے پھرنے کے نہیں قائل ہیں اور ان کا کہنا ہے کہ ''جو آنکھ ہی سے نہ ٹپکے تو پھر لہو کیا ہے'' چنانچہ پوری کتاب اشکوں کا ہار بن گئی ہے، آنسو تھمنے کا نام نہیں لیتے ہیں۔ایسا لگتا ہے کہ یہ برسات رکنے والی نہیں ہے۔ اشعار پر اشعار، نظموں پر نظمیں۔شاعر کے دل پر جو کچھ گذری ہے اور گذرتی رہی ہے، اس کو اس نے نظموں میں ڈھال دیا ہے۔دیکھیے وہ کہہ رہے ہیں۔

قومِ مسلم خوف و دہشت سے نہاں خانے میں ہے
بولہب ہر وقت اس امت کو تڑپانے میں ہے
گیسوئے ملت اگر سلجھے تو سلجھے کس طرح
طبقۂ مسلم ہی اس گیسو کو الجھانے میں ہے
ہفتہ بھر میں ایک سجدہ وہ بھی صحرائے خیال
جسم مسجد میں ہے لیکن دل صنم خانے میں ہے

....

درد نے ہر مفہوم بھلایا کیا ہے سحر اور شام ہے کیا
ہم کو نہیں معلوم عزیزو! چین ہے کیا آرام ہے کیا
جادۂ منزل چھوڑ کے ہم ہیں منزل کی خوش فہمی میں
جان لو اب تو دوستو تم بھی شرحِ خیالِ خام کیا
آنکھ کھلی تو رزق تلاشا رزق ملا تو لیٹ گیے
کھانا، سونا ، اٹھ کر کھانا ، اور ہمارا کام ہے کیا
قربتِ سلطاں ، ابن الوقتی ، مسند خواہی ، لادینی
ہند میں آؤ ، دیکھ لو آ کر قائد کا انجام ہے کیا
اہلِ حرم گر دین نہ جانیں اس پر حیرت کیا کرنا
اہلِ حرم بھی جان نہ پائے دین ہے کیا اسلام ہے کیا

....

مرے اشعار سناٹوں کے یوں خاکے اڑاتے ہیں
اندھیری رات میں جیسے ستارے جگمگاتے ہیں
عجب انداز ہے تہذیبِ نو کے گل فشانوں کا
اندھیروں کی اشاعت کے لیے شمعیں جلاتے ہیں
عقابوں کے نشیمن اب ہیں زاغوں کے تصرف میں
جنہیں پینا نہیں آتا وہ میخانے چلاتے ہیں
عزیز ہر کوئی کافر ابو طالب نہیں ہوتا
جو کافر ہیں ہمیشہ کفر کے ہی کام آتے ہیں

....

ہم نے ہی لہو دے کر گلشن کو سنوارا ہے
کہتے ہیں مگر ظالم کیا اس میں تمہارا ہے
اس ملک پر صدیوں تک ہم نے بھی حکومت کی
بتلائے کوئی ہم نے مظلوم کو مارا ہے

بو جہل زمانہ کو یہ اوج نہ مل پاتا
افسوس کہ گردش میں ملت کا ستارہ ہے
توحید کے نغمے ہم مسجد کے مناروں سے
سو بار پکاریں گے سوبار پکارا ہے

....

نہ میں گلشنوں کا نکھار ہوں نہ میں بلبلوں کی بہار ہوں
جو خزاں کے جال میں پھنس گئی وہ لٹی پٹی سی بہار ہوں
مرا گھر مکان اجڑ گیا مرا خاندان بچھڑ گیا
ابھی گرم کوچۂ قتل ہے میں کھڑا شریکِ قطار ہوں
کوئی ہم زباں کوئی مہرباں نہ مرا کوئی بھی نگاہ باں
جو شکارِ گردشِ وقت ہے میں ہرن کی ایسی ہی ڈار ہوں
وہ جو بے بسی کی شکار ہے وہ جو راستے کا غبار ہے
اسی مردہ قوم کا فرد ہوں وہ فدائے گیسوئے دار ہوں
کوئی ہم خیال نہ ہم سخن کوئی بارگاہ نہ انجمن
نہ زباں پہ کوئی گلہ فغاں میں وہی چراغِ مزار ہوں

یہ اشعار کافی ہیں فضیل ناصری کا رنگ و آہنگ جاننے کے لیے۔ گردشِ ایام کا کوئی عنوان نہیں ہے جس پر انہوں نے اپنے خاص اسلوب میں اظہارِ خیال نہ کیا ہو۔ اب کچھ اشعار موضوع کے اعتبار سے دیکھیے۔

ہجومی تشدد میں شکار ہونے والے مسلمان

اخلاق کے ٹکڑے ہوتے رہے بہتا ہی رہا پہلو کا لہو
جاگے رہے سب ایمان والے بھائی کو بچانا بھول گیے

مسلمانوں کا انکاونٹر

کبھی تو پھانسی میں جان لے لی کبھی تو انکاونٹر میں مارا
تلاش کرتے ہیں ہر بہانے یہ خون مسلم بہانے والے

برما اور فلسطین

پھر آگ کا دریا ہے برما سے فلسطیں تک
لازم ہے کہ مومن بھی، اب سر بہ کفن ہولیں

بابری مسجد

مسجدِ بابری تم نے ڈھادی رام مندر بھی بن کر رہے گا
کب تلک ہم پہ جاری رکھو گے، سلسلے تم یہ اپنی جفا کے

....

مسجدِ بابری جاتی ہے تو جانے دو مگر
کفر کے ساتھ کسی حال میں سودا نہ کرو

مسجد اقصی اور حرم کے شیخ

چشمِ حرم کی نیند اڑادی صہیونی خونخواروں نے
قدس کو مرکو ٹھہرایا ہے فطرت کے بیماروں نے
سر بہ کفن ہو کلمہ والو مسجدِ اقصی روتی ہے
دیکھو کیسا جال بنا ہے دجالی کرداروں نے
خاک عرب کے شیخ پڑے ہیں جامِ تعیش پی پی کر
چھوڑ دیا اسلام کو تنہا، کعبہ کے معماروں نے

رجب طیب اردغان

وہی مردِ خدا پھر پرچمِ حق لے کے اٹھا ہے
سنا تھا ذکر جس کا ہم نے ایوبی فسانوں میں
وہ سلطاں بھی قلندر بھی مجاہد بھی مجدد بھی
رجب طیب کی ہستی ہے خدا کے ارمغانوں میں

”آؤ کہ لہو رولیں“ ایک داستان غم ہے۔ یہ داستانِ غم تمام باشعور مسلمانوں کی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ کیا ہم ہمیشہ لہو روتے رہیں گے یا خوشی اور نصرت اور کامرانی کے دن بھی واپس آئیں گے اور اگر ہمیں اپنی عظمتِ گم گشتہ کو واپس

لانا ہے اور اوج وعروج اور کامرانی کے زمانے کو لوٹانا ہے تو ہمیں کیا کرنا چاہئے ؟ یہ بہت اہم سوال ہے ۔ اگر ہم صرف لہو روتے رہے اور داستانِ غم رقم کرتے رہے تو کوئی فائدہ نہیں ہے ۔ راقمِ سطور کے کچھ نظریات ہیں جو سینہ میں امانت ہیں ،آج موقعہ ہے کہ میں ان نظریات کو اہل علم کے سامنے پیش کروں ۔ میرے پاس ترقی کی باز آفرینی کا ایک فارمولا ہے ۔

قرآن میں اللہ تعالی فرماتا ہے: ﴿ **وما أرسلنا من رسول إلا بلسان قومه** ﴾ یعنی ہم نے جس رسول کو بھی بھیجا وہ لسانِ قوم میں بات کرتا تھا، یعنی لسانِ قوم میں خدا کا پیغام پہونچاتا تھا۔ معلوم یہ ہوا کہ تمام زبانوں میں ''لسانِ قوم'' سب سے افضل ہے، اور مسلمانوں کے لیے انبیاء کی تبعیت میں خدا کے پیغام کو قوم تک لسانِ قوم میں پہونچانا ضروری ہے ۔ اس لیے قوم کی زبان سب سے اہم زبان ہے ۔ قرآن کا ناطق فیصلہ یہی ہے ۔ حدیث میں ہے کہ **کلموا الناس علی قدر عقولهم** یعنی عقلیں جو زبان سمجھتی ہیں ان کی رعایت کرو یعنی قوم اگر ہندی یا بنگالی سمجھتی ہے اور آپ اس سے فصیح وبلیغ اردو میں گفتگو کریں تو یہ غلط بات ہوگی اور اگر سرے سے قوم کو مخاطب نہ بنائیں تو یہ اور بھی غلط بات ہوگی اور انبیائی طریقے سے انحراف ہوگا ۔ ختم المرسلین خاتم النبیین حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب نے لسانِ قوم میں خدا کا پیغام پہونچانے کا کام اتنی طاقت سے کیا کہ نہ صرف جزیرۃ العرب بلکہ آس پاس کی قومیں بھی مسلمان ہوگئیں ۔ جب ساری آبادی یا ان کی غالب اکثریت مسلمان ہوگئی تو وہ کام ہوا جو ہونا چاہئے تھا اور جس کام کے لیے اللہ تعالیٰ نے راہ ہموار کردی تھی یعنی علومِ اسلامیہ کی تشکیل وتدوین کا کام ۔ صحاح ستہ کی تدوین ہوئی ، ائمہ اربعہ نے فقہ کی تدوین کی ، سیرتِ نبوی پر کتابیں لکھی گئیں، اسلامی علوم کے ہر شعبے کے لیے جلیل القدر علماء پیدا ہوئے ۔ عصرِ حاضر میں ہندوستان کے علماء میں جن لوگوں نے لسانِ قوم کو مرکزی اہمیت دی ان میں ڈاکٹر حمید اللہ کا نام سب سے زیادہ روشن ہے ۔ فرانس میں قیام کے زمانے میں انہوں نے قرآن مجید کا فرانسیسی میں ترجمہ کیا اور سیرت پر انگریزی اور فرانسیسی میں بھی کتاب لکھی اور ان کے ہاتھ پر بہت بڑی تعداد میں فرانسیسیوں نے اسلام قبول کیا۔

مسلمانوں کو اسلامی تاریخ کے سفر کے دوران لسانِ قوم سے دست کشی اور دستبرداری کا بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے۔ اندلس میں مسلمانوں نے سات سو اسی برس حکومت کی لیکن مسلمانوں نے لسانِ قوم کو سیکھنے سے اعراض کیا اور لسانِ قوم میں انبیائی دعوت پیش کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی ۔ فاتحین اور مفتوحین کے درمیان زبان کی خلیج حائل رہی ، وہاں فاتحین ہمیشہ اقلیت میں رہے اور باہمی اختلافات کا شکار بھی ہوئے اور وہاں سے پھر انہیں رختِ سفر باندھنا پڑا ۔ تاریخ اور انبیاء کے منہج کے مطالعہ کا حاصل یہ ہے کہ مسلمان جب کہیں اقلیت میں ہوں تو لسانِ قوم میں خطاب کرنے والے علماء کو سامنے آنا چاہئے ۔ ایسے علماء نہ اسپین میں سامنے آئے نہ ہندوستان میں ۔ ہندوستان میں آج بھی علماء لسانِ قوم میں قوم کو خطاب نہیں کرتے ہیں بلکہ لسان المسلمین میں مسلمانوں کو خطاب کرتے ہیں اور یہ بات انبیائی طریقے کے مطابق نہیں ہے ۔ علومِ اسلامیہ سے شغف یا اردو میں نصیحۃ المسلمین بہت قیمتی بات ہے لیکن اس کا درجہ قوم میں لسانِ قوم کے ذریعہ اصل دعوتِ توحید کے بعد آتا ہے ۔ ہمارے علماء کے ذہن سے وہ کارِ

نبوت نکل گیا اور مسلمانوں کے درمیان تزکیہ ونصیحت کا کام اصل ٹھہرا ۔ بے شبہہ انبیاء یہ کام بھی انجام دیتے ہیں یعنی مسلمانوں کا تزکیۂ نفس بھی کرتے ہیں، لیکن یہ کام انجام پاتا ہے مشرکین اور کفار کو ایمان کی دعوت دینے کے ساتھ ساتھ۔ غور کیجیے مولانا قاسم نانوتوی دار العلوم دیوبند قائم کرتے ہیں اور اس منہج کے بے شمار مدرسے ہندوستان میں قائم ہوتے ہیں لیکن ان اداروں سے فارغ ہونے والے سیکڑوں ہزاروں علماء صرف مساجد میں لسان المسلمین میں لاکھوں مسلمانوں کے سامنے خطاب کرنے کے لائق ہوتے ہیں۔ وہ لسانِ قوم میں قوم سے خطاب کرنے کے لائق ہی نہیں ہوتے ہیں۔ انگلینڈ کے چند نومسلم حضرات دینی علوم سیکھنے کے لیے ہندوستان آئے ۔انہوں نے بہت سے شہروں میں مدرسے دیکھے۔ ہر جگہ اردو میں تعلیم تھی جوان کے کام کی نہیں تھی۔ وہ ناکام اور نامراد واپس چلے گیے۔ مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی قیادت میں دنیا کی سب سے بڑی دینی تحریک (تبلیغی جماعت) برپا ہوئی۔ اس تحریک کے چھ اصولوں میں اکرامِ مسلم کا اصول تو موجود ہے لیکن غیر مسلم قومیں اور برادرانِ وطن اس تحریک کے بانی کے ذہن میں دور دور موجود نہیں تھے۔ بلا شبہ دار العلوم دیوبند اور دوسرے دینی اداروں کی خدمات بہت ہیں اور تبلیغی جماعت کی خدمات بھی لائقِ رشک ہیں لیکن ہماری جو تنقید ہے وہ بھی اپنی جگہ پر سوفی صد پر درست ہے بلکہ زیادہ درست بات یہ ہے کہ یہ حالات کا گہرا مطالعہ ہے اور تحلیل وتجزیہ ہے۔ لسانِ قوم اور قوم کی اہمیت کو نظر انداز کرنا انبیائی طریقہ نہیں ہے۔ آج جو حالات پیدا ہوگیے ہیں جن کی وجہ سے ہم سب نثر میں اور شعر میں لہو روتے ہیں وہ انبیائی طریقہ کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئے ہیں۔ اس انبیائی طریقہ کو اسپین میں بھی نظر انداز کیا گیا اور ہندوستان میں بھی نظر انداز کیا گیا۔ اسپین میں اسلام اور مسلمانوں کی تاریخ ختم ہو چکی اور کچھ لوگوں کے نزدیک ہندوستان اسپین کے راستہ پر ہے۔ میری تلخ نوائی کو گوارا کیا جائے کہ ''زہر بھی کبھی کرتا ہے کارِ تریاق''۔ میں بھی لہو روتا ہوں لیکن میرا رونا ''نالہ طائر بام ہے' نالہ زیر دام نہیں ہے' میں نے مقدمہ میں تھوڑی سی دراز نفسی سے کام لیا ہے کیونکہ مجھے اپنی بات کہنی تھی۔ بقول اقبال ؎

نغمہ کجا و من کجا ساز سخن بہانہ است
سوئے قطار می کشم ناقۂ بے زمام را

مجھے اعتراف ہے کہ میں اپنے نظریہ کی تائید میں کسی اہم اور معتبر شخصیت کا حوالہ نہیں دے سکتا ہوں۔ نہ غزالی نہ ابن اتیمیہ نہ ابن خلدون اور نہ شاہ ولی اللہ ہلوی نہ کوئی اور۔ ممکن ہے کسی نے یہ بات کہی ہو لیکن مجھے اس کا علم نہیں۔ میری اس بات کی تغلیط یا تردید کے لیے دو باتوں کا ثبوت پیش کرنا ہوگا۔

۱۔ انبیاء مشرکین اور کفار کو توحید کی دعوت لسانِ قوم کے علاوہ کسی اور لسان میں دیتے تھے۔
۲۔ اسپین اور ہندوستان میں مسلمانوں نے توحید کی دعوت دینے کے لیے بڑے پیمانہ پر اور عمومی طور پر لسانِ قوم کو ہی ذریعہ بنایا تھا۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا اتنے بڑے ملک ہندوستان میں اور تاریخ کے سفر میں کوئی ایسا فرزانہ نہ تھا جسے لسانِ قوم کی اہمیت معلوم ہو اور وہ انحراف کو ٹھیک کرنے کی کوشش کرے اور گاڑی جو پٹری سے اتر گئی ہے اسے دوبارہ پٹری پر لائے۔ غالبا اس کی وجہ یہ ہے قرآن میں یہ بات امر کے صیغہ میں نہیں

کہی گئی ہے ، اگر کہی گئی ہوتی فقہاء اسلام اسے بھی فرائض و واجبات کے زمرے میں داخل کر دیتے جیسے وہ نماز وزکا تکے احکام کو داخل کرتے ہیں ۔ ابن خلدون فلسفۂ تاریخ کے بیان میں جن نتائج تک پہونچتے ہیں وہ تعمق اور تدبر کا حاصل ہوتے ہیں ۔تفکر کی صفت وہ جھکی ہوئی شاخِ ثمر نہیں ہوتی ہے،جس سے پکے ہوئے پھل کو توڑ لیا جاتا ہے اور مسائل واحکام کی کتاب تیار کرلی جاتی ہے۔ایک مفکر کا کام فقیہ سے الگ ہوتا ہے۔اس عاجز نے جو بات کہی ہے وہ اگرچہ اتنی صراحت کے ساتھ اور کسی نے نہیں کہی ، تاہم اس کام کا کسی درجہ میں ہلکا سا شعور بہت سے لوگوں کو رہا ہے۔ ہندوستان میں صوفیاء کرام کو اس کا احساس رہا ہے کہ عوام سے رابطہ قائم کرنا اور ان سے ان کی زبان میں بات کرنا ضروری ہے ۔ان میں سے کچھ لوگوں نے ''قوم'' سے ''لسانِ قوم'' میں خطاب کیا اور دینِ اسلام کا تعارف کرایا اور عصرِ حاضر میں بھی اس احساس کا عکس دیکھا جاسکتا ہے ۔ یہی وہ شعور ہے جس نے ہندوستان کی جماعتِ اسلامی کو مجبور کیا کہ وہ ہندوستان کی تمام زبانوں میں قرآن کا ترجمہ اور اسلامی لٹریچر پیش کرے اور یہی وہ شعور ہے جس نے مفکر اسلام مولانا ابو الحسن علی ندوی کو مجبور کیا کہ وہ اذکار واشغال کے خلوت کدے سے اور بادۂ علم وعرفاں کے میکدے سے باہر نکلیں اور برادرانِ وطن کو خطاب کرنے کے لیے پیامِ انسانیت کی تحریک شروع کردیں۔

اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے مستقبل کی تاریخ ایسی بنے کہ ہمیں بار بار لہو رونے کی ضرورت نہیں پیش آئے اور بار بار کوئی فضیل ناصری جیسا سخن ور نغمہ سرا نہ ہو تو لسانِ قوم میں برادرانِ وطن کو خطاب کرنے کی منصوبہ بندی کرنی ہوگی اور اس کے مطابق مدارس کے نصاب میں انقلابی تبدیلی لانی ہوگی ۔قوم کے عقیدہ اور مذہب اور تہذیب اور زبان سے واقف علماء کو سامنے آنا ہوگا۔ مجھے احساس ہے کہ میری یہ بات چونکہ نئی ہے اور چونکا دینے والی ہے اور اسلاف میں سے کسی شخصیت کی اتنی صراحت کے ساتھ کہی ہوئی نہیں ہے ،اس لئے آسانی سے قبول نہیں ہوگی ۔

کوئی پھول دھوپ کی پتیوں میں ہرے ربن سے بندھا ہوا
یہ غزل کا لہجہ نیا نیا نہ کہا ہوا نہ سنا ہوا

جناب فضیل ناصری بڑے شاعر ہیں اور بہت بڑے فنکار ہیں ،غمِ حالات کے نوحہ گر ہیں ،مسلمانوں کے مرثیہ خواں ہیں،ان کی قدر کی جانی چاہئے۔انہوں نے شعر کی زبان میں حالات کا جو منظر نامہ پیش کیا ہے وہ میرے علم کے مطابق اب تک کسی نے نہیں پیش کیا ہے۔انہوں نے سارے جہاں کے درد کو جمع کر کے دیوان کیا ہے۔عصری حسیت کا لفظ اردو تنقید میں بہت عام ہو چکا ہے،عصری حسیت کے مواد سے فضیل ناصری کی شاعری معمور اور اور بادۂ غم سے مخمور ہے،ان کی شاعری آسانی سے بھلائی نہیں جاسکے گی ۔اب ایسا کوئی چاک گریباں نہ آئے گا۔اس کے باوجود اس میں مسائل اور مشکلات کا کوئی واضح حل نہیں پیش کیا گیا تھا۔مقدمہ نگار نے اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے ۔ مجھے محسوس ہوا کہ شاعر نے صرف مقدمہ لکھنے کے لیے نہیں کہا تھا بلکہ یہ بھی کہا تھا ۔

چاند سا مصرعہ اکیلا ہے مرے کاغذ پر
تم بھی کچھ لکھ دو مرا شعر مکمل کردو

☆☆☆☆☆☆☆☆☆

☆☆☆☆

شمشیر گمشدہ

اقبال کی نایاب تاریخی نظم

ڈاکٹر رؤف خیر

اپنی خودنوشت سوانح حیات ''اپنا گریباں چاک'' (سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور مطبوعہ ڈسمبر 2002ء، اضافہ شدہ ایڈیشن، مارچ 2006ء کے باب ''نامعلوم منزل کی طرف'' صفحہ نمبر 292 پر) جسٹس ڈاکٹر جاوید اقبال نے انکشاف کیا ہے کہ علامہ اقبال نے سری رنگا پٹنم کے مقام پر شیرِ میسور ٹیپو سلطان کے مزار کی زیارت کی تھی تو پانچ شعر کی ایک نظم لکھی تھی جس کے عنوان ''شمشیر گم شد'' سے ٹیپو سلطان کی شہادت کا سن ۱۲۱۴ھ مطابق ۱۷۹۹ء برآمد ہوتا ہے۔ یہ فارسی نظم علامہ اقبال کے کسی مجموعے میں شامل نہیں ہے۔ یہ نایاب تاریخی نظم رؤف خیر کے منظوم اردو ترجمہ کے ساتھ پیش ہے۔

آتشے در دل دگر برکردہ ام	میرے دل میں اک حرارت بھر گئی
داستانے از دکن آوردہ ام	یہ دکن کی داستاں کیا کر گئی
در کنارم خنجرِ آئینہ فام	کانچ سا خنجر مرے پہلو میں ہے
می کشم او را بتدریج از نیام	دھیرے دھیرے میان سے کھینچوں اسے
نکتہء گویم ز سلطانِ شہید	مجھ سے کہتے تھے یہ سلطانِ شہید
زا ں کہ ترسم تلخ گردد روزِ عید	ڈر ہے، سن کر تلخ ہوگی تیری عید
پیشتر رفتم کہ بوسم خاکِ او	مس ہوئے جب لب مرے اُس خاک سے
تاشنیدم از مزارِ پاکِ او	اک ندا آئی مزارِ پاک سے
در جہاں نتواں اگر مردانہ زیست	جی نہیں سکتا جہاں مردانہ وار
ہم چو مرداں جاں سپردن زندگیست	مر تو سکتا ہے وہاں مردانہ وار

علامہ اقبال

افسانہ

تحریک

جیلانی، بی اے

سیاست دان کی تحریکِ آزادیِ نسواں دو سال کے بعد رنگ لائی، جب ملک کی مجلسِ قانون ساز کے حزبِ مخالف نے بھی اس کے دعوی کو تسلیم کرلیا۔ ایوان میں اس نے اپنی مشہور تقریر ان فقروں پر ختم کی ''قوم کی آزادی اور ترقی عورت کی آزادی اور ترقی ہی میں مضمر ہے، عورت کو آزاد کردو اور قوم بجلی کی سی سرعت سے ترقی وعروج کی رفعتوں پر پہنچ جائے گی'' ایوان تالیوں کے شور سے گونج اٹھا اور رؤسائے ملک نے اس کی حمایت میں ہاتھ بلند کردیئے۔

مجلس کے اختتام پر سیاست دان فرحاں وشاداں اپنی محبوبہ کے پاس آیا۔ اس کا سانس پھول رہا تھا اور چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ اس نے اس کا ہاتھ چومتے ہوئے کہا ''میری جان! میں نے تمھارے ایما پر، صرف تمھاری خوشنودی کے لیے میں نے تمھاری جنس کو قعرِ مذلت سے عروجِ کمال تک لا پہنچایا ہے۔ کیا اب بھی تم خوش نہیں؟ کیا اب بھی تم رُوٹھے منہ سے ایک بار ہاں نہ کہوگی؟ مجھے حکم دو تو میں حکومت کا تختہ الٹ دوں، رؤسائے ملک تمھارے در پر دست بستہ کھڑے ہوں۔ کیوں میرے پھول! کیا اب بھی میں نظرِ التفات کا حق دار نہیں؟''۔

وہ مسکرائی اور اس کے دانتوں کی چمک سے سیاست دان کی آنکھیں خیرہ ہوگئیں ''کیوں نہیں، امتحان کی کٹھن گھڑیاں گزر گئی ہیں، اب ہم ہمیشہ اکٹھے زندگی بسر کریں گے''۔

سیاست دان کی کوششیں بارآور ہوئیں اور چند ہی دنوں میں آزادیِ نسواں کا چرچا زباں زدِ عام ہوگیا۔ اس فیروزمندی پر، اس پر تحسین وآفریں کے پھول برسنے لگے۔ بیدار مغز اور روشن خیال لوگوں نے اپنی عورتوں کو رضا کارانہ آزادی دے دی۔ انھوں نے دھکے دے دے کر دقیانوسی خیالات کی عورتوں کو گھروں کی اندھیری چاردیواری سے باہر نکالا۔

تحریک چلتی چلتی چل پڑی اور وبا کی طرح ملک میں پھیل گئی۔ شہروں، گاؤں اور محلوں میں ایسی متعدد جماعتیں قائم ہوگئیں جن کا مقصدِ وحید مردہ عورت کو زندہ کرنا تھا۔ اور قلیل ہی عرصے میں ملک کے تاریک کونوں اور شہر کی

اندھیری گلیوں سے مدفون حسن برآمد ہونے لگا۔لوگوں کی حُسن ناشناس آنکھیں یہ مناظر دیکھ کر چندھیا گئیں۔نظرباز نقادوں نے اس کو پرکھا' جرائدورسائل نے نئے اکتشافات سے ملک بھرمیں ہل چل مچادی۔لوگ حُسن کودیکھ دیکھ کرجھوم رہے تھے'اوروارفتہ اشعار پڑھ رہے تھے۔مفسرینِ حُسن کی مانگ ہوئی اور یک بیک نئے نئے شاعر' مصوّر اور سنگ تراش پیدا ہوگیے۔ پرانے کھوسٹ راگیوں نے اپنے سرتال درست کیے اور سازندوں نے اپنی ستاروں کی زنگ آلودہ تاروں کو نئی کھنکتی تاروں سے بدل دیا۔ شاعر نے الفاظ میں ایسا جادوبھردیا کہ شعرسنتے ہی تخیل ستاروں کی دنیا میں پہنچ جائے۔مصور نے تصویر میں نور بھردیا اور سنگ تراش نے آسمانی روح کو پیراہنِ مرمریں پہنادیا۔ یہ دنیا بھرمیں حسن و جمال کے لحاظ سے باقی سب ہم عصر ملکوں سے سبقت لے گیا۔

اور یہ سب تنہا سیاست دان کے زورِ بازو کا نتیجہ تھا۔

وہ دونوں ایک خوب صورت محل میں رہنے لگے'جو ملک نے سیاست دان کی خدمات کے صلے میں بطورانعام اورشکریہ کے پیش کیا تھا۔سیاست دان کی زندگی سونے کی طرح دمکنے لگی۔حسرت و یاس کے بادل چھٹ گیے۔ وہ مسرور تھا کہ اس نے اپنا گوہرِمقصود پالیا۔دھوپ پہلے سے زیادہ سنہری اور چاندنی چٹکیلی ہوگئی۔سارادن وہ مسرت سے کھیلتے' ہنستے اور کھلکھلاتے' بازو میں بازو ڈالے انھوں نے ملک کے ایک ایک گل گشت' چمن اور سبزہ زار پھولوں کی تلاش میں چھان مارے۔چاندنی راتوں میں کشتی پر بیٹھے سیاست پر شیریں مباحث چھیڑتے ہوئے انھوں نے دریا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک سیرکرلی۔مگر کچھ عرصہ کے بعد اس کی محبوبہ کی دلچسپی ان سیروں میں کم ہونے لگی۔سیر کے وقت وہ سیاسی بحث بالکل پسند نہ کرتی اور ایک دن جب سیاست دان سیر کے لیے تیار ہواتو اس نے ساتھ جانے سے انکارکردیا۔

سیاست دان نے مضطرب ہوکر پوچھا ''میری جان! کس چیز نے تمھیں تکلیف دی'اگر کہوتو میں تمام دنیا کی قوتیں تمھارے قدموں میں لاڈالوں۔مجھے ایک بار حکم کرو اور دیکھو میں تمھارے لیے کیا کرسکتا ہوں''۔

''پیارے!چندروز سے یہ ساری سیریں اور بحثیں میرے دل پر گراں گزرنے لگی ہیں' بار بار وہی چیز' میں اس تکرار سے اکتاگئی ہوں' میں کچھ تغیر چاہتی ہوں''۔

''تو ہم اسے ترک کردیں گے' میں اس پھول کی پتی جیسے نازک دل پر شبنم کا بوجھ گوارا نہیں کروں گا' کہو تو میں ملک کے بہترین شاعروں کی مجلس بلالوں''۔

عورت نے مسکرا کر اثبات میں سرہلادیا۔

چند ہی دنوں میں ملک کا بہترین شاعر اپنے شاگردوں سمیت ان کے محل میں داخل ہوا' سیاست دان نے

ان کا استقبال بڑے تپاک سے کیا ''مگر وہ آپ کے پیچھے کون صاحب ہیں؟''۔اس نے ایک گنجے سر والے شخص کی طرف اشارہ کیا جو شاعروں کی ٹولی کے پیچھے گنگناتا آرہا تھا۔

شاعر نے جلدی سے معذرت کی اور بولا ''یہ مشہور راگی ہیں اور جدید موسیقی کے مؤسس''۔

عورت بے ساختہ بول اُٹھی ''بہت خوب''۔

شاعر نے کہا '' شعر' نغمے کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتا' کہاوت ہے کہ شاعری موسیقی کی چھوٹی بہن ہے''۔

اب عورت کے رخساروں پر سرخی عود کر آئی ۔ چاندنی راتوں میں' درختوں کی اوٹ میں وہ اپنی محفلیں جماتے جہاں پر چاند کی سیمیں کرنیں پتوں میں سے چھن چھن کر ان کے چہروں اور آنکھوں پر کھیلتیں اور وہ سبزے پر دراز اشعار اور موسیقی کی دھندلی دنیا میں جل پری کی طرح تیرتی ہوئی جا پہنچتی۔پھر کبھی ایسا ہوتا کہ وہ الفاظ کی سیڑھی پر چڑھتی ہوئی ستاروں کی بستی میں پہنچ جاتی' جہاں حسن کی ندی بہتی ہے اور عشق پانی میں اپنے ہی چہرے کے عکس پر ریجھا بیٹھا آہیں بھر رہا ہے۔اس کے اوپر نغموں کی پھوہار پڑ رہی تھی۔ اس طرح اس کے دن' الفاظ اور خیال کے عالم میں گزر رہے تھے۔سیاست دان خوش تھا کہ اس کی محبوبہ خوش تھی۔

مگر ایک دن سیاست دان کا دل پھر دھک سے رہ گیا' جب اس نے دیکھا کہ اس کی محبوبہ کے رخساروں کی سرخی کافور ہوتی جارہی ہے۔اس نے دیکھا کہ جب شاعر اپنی اپنی بیاض نکالتے تو وہ دوسری طرف تکنے لگتی۔

ایک صبح سیاست دان نے اس کا چہرہ بالکل سفید دیکھ کر پوچھا ''میری جان! کیا وجہ ہے کہ آج گلاب نے اپنا رنگ بدل لیا ہے''۔

اس نے کھڑکی کے باہر دیکھتے ہوئے کہا '' میں تھکاوٹ اور سستی محسوس کر رہی ہوں''۔

''مگر شاعر اور موسیقی کار کہتے ہیں کہ ان کا فن روح کو بلند کرتا ہے''۔

ہاں وہ کہتے ہیں لیکن جلد ہی وہ حسن کو چھوڑ کر اپنے آپ میں کھو جاتے ہیں۔وہ خود غرض ہیں''۔

سیاست دان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر انوکھی تنقید سن رہا تھا۔

''شاعر کے الفاظ محض کالی روشنائی نظر آتے ہیں اور موسیقی محض نپی تلی متواتر کھٹ کھٹ' میرے تو کان پک گیے ہیں' شعر و نغمہ سنتے سنتے ۔ میں تبدیلِ محفل چاہتی ہوں' کیوں پیارے تم مجھ سے اتفاق کرتے ہو''؟۔

''کیوں نہیں ۔تو اب کے مصوروں کو بلاؤں' کہتے ہیں ہمارے پاس رنگ و روشنی کی دنیا ہے اور ہم نظر کے توسل سے روح پر مرہم لگاتے ہیں''۔

دوسرے دن ملک کا بہترین مصور ہاتھوں میں رنگ کا ڈبہ اور موقلم تھامے اپنے جلو میں طلبائے فن کا ایک جم غفیر لیے آموجود ہوا۔انھوں نے باغ کے ایک تنہا گوشے کو

اپنا مسکن بنالیا۔مصور عجیب قسم کا آدمی تھا۔ ہر وقت عورتوں اور پھولوں کو خاموش ٹکٹکی لگائے دیکھتا رہتا۔ایسی ٹکٹکی کہ یہی معلوم ہو کہ ابھی اس کو اپنی آنکھوں سے نگل لے گا۔مصور نے عورت کو دن کے سفیدے اور رات کے دھندلکے میں حسن کی لازوال کیفیات دکھائیں۔ وہ خواب کی دنیا کے تصورات کو قرطاس پر لکۂ ابر کی طرح جکڑ دیتا۔اضطراب اور یاس کو رنگ کی دنیا میں بھی رنگین کر دیتا۔

اس نے کہا میں نظر کو قید کر سکتا ہوں۔اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں اس نے عورت کی تصویر بنانی شروع کی۔اس کے شاگرد قطار باندھ کر بیٹھ گیے اور سب نے اس کی طرف سانپ کی طرح ٹکٹکی لگا دی۔ ہر بار وہ تصویر بنانے بیٹھتا تو کہتا ''اب میں ایک لازوال شاہکار پیش کروں گا اور ہر بار وہ متعجب سوچتی کہ وہ شاہکار کب معرضِ وجود میں آئے گا''۔

وہ ان سے بھی تنگ آ گئی۔

ایک شام وہ سیاست دان کو اطلاع دیئے بغیر اکیلی ہی سیر کو چل دی اور رات گیے واپس آئی۔ سیاست دان فکر میں غلطاں دروازے پر کھڑا تھا۔ جب وہ آئی تو اس نے دیکھا کہ اس کی محبوبہ کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔اس کا دل دھک سے رہ گیا۔اندر آتے ہی وہ کرسی پر گر گئی اور اپنے چہرے کو دونوں ہاتھوں سے ڈھانپ لیا۔''میرے دل میں اضطراب اور بے کلی طوفانی سمندر کی موجوں کی طرح اُٹھ رہی ہے''۔

''میری جان! کیا مصور کا دعویٰ بھی بالکل باطل نکلا''۔

''بالکل تصویر محض رنگ کے دھبے ہیں۔ وہ پہلے پہل ہی ایسا نظر آتے ہیں۔ بعد میں وہ بھی آنکھوں کے رنگوں میں گھل مل جاتے ہیں۔مصور نے میرے جسم کو اپنی نوکیلی نگاہوں سے چھلنی کر دیا ہے، چوہا!''۔

''اگر کہو تو سنگ تراش بلا لیا جائے۔ وہ موسیقی کو پتھر میں منجمد کرنے کا دعویٰ رکھتا ہے''۔

تھوڑے ہی دنوں کے بعد باغ میں چاروں طرف اور محل کی طویل غلام گردشوں میں مکمل اور نامکمل، ثابت اور ٹوٹے ہوئے اعضا والے مجسمے کھڑے تھے۔وہ اپنی پتھریلی نگاہوں سے گذرنے والے کو گھورتے اور سنگ تراش اپنے تیشوں اور چھینیوں سے ان میں جان ڈال رہے تھے۔ملک کا سب سے بڑا سنگ تراش ایک موٹا آدمی تھا۔وہ اس کو ہر مجسمے کے پاس لے جاتا اور اس کی آرائشِ جمال کا فلسفہ سمجھاتا۔ اس نے کہا ''سنگ تراشی حسن کو ٹھوس صورت میں ظاہر کرتی ہے۔وہ سماوی حسن کے متناسب اعضا اور اس کے ڈھانچے کو مرمر میں ڈھال کر دنیا کے سامنے پیش کرتی ہے''۔ان میں بہترین مجسمہ وہ تھا جس نے نسوانی حسن کو بے حجاب کر دکھایا تھا۔اس مجسمے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ''یہ میری زندگی کا حاصل ہے، شاہِ ایران اسے اپنے خزانے کے بہترین

ہیرے سے خریدنا چاہتا تھا''۔

ایک صبح وہ اپنے کمرے سے باہر نہ نکلی۔ سیاست دان حالتِ تشویش میں اس کے کمرے کی طرف گیا۔ مگر اسے اندر سے مقفل پایا۔ اس نے دستک دی مگر جواب ندارد۔

''میری جان دروازہ کھولو''۔

''آج میں باہر نہیں آؤں گی''۔

''میری نرگس' ایک بار اپنی صورت تو دکھادو''۔

جب اس نے دروازہ کھولا تو اس کی حالت عجیب ہو رہی تھی۔ اس کا چہرہ اترا ہوا تھا اور رنگ ہلدی کی طرح زرد تھا۔ آنکھیں سُرخ اور سوجی ہوئی تھیں۔

سیاست دان کی زبان لڑکھڑا گئی۔ میری جان! کیا اب کے حسنِ مرمریں بھی سکون نہ بخش سکا''۔

جواب دینے کی بجائے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ''یہ سب عبث ہے' مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے گویا میرا دل خلا میں ڈوبا جا رہا ہے۔ بے قراری' اضطراب' درد اور کرب میرے دل میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے وحشی ناچ ناچ رہے ہیں''۔

سیاست دان گم سم بیٹھا تھا۔ ''تم خود ہی کہو' اب میں تمھارے لیے کیا کروں''۔ وہ چپ رہی۔

''میری جان! اب تو میں ہی باقی رہ گیا ہوں''۔

ایک پھیکی سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر ہویدا ہوئی۔ گویا وہ اس کی حماقت پر ہنس رہی تھی۔

دوسرے دن جب وہ اسے جگانے گیا تو بستر میں اس کی بجائے ایک پیلا لفافہ پڑا تھا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے لفافہ چاک کیا۔ کاغذ کے عین وسط میں ایک فقرہ لکھا ہوا تھا۔

''تم عورت کو نہیں سمجھتے''۔

وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔ وہ اسی طرح بیٹھا رہا۔ حتیٰ کہ بھوک اس کے پیٹ میں کلبلانے لگی۔ جب اس نے اپنے ملازمِ خاص کو آواز دی تو وہ بھی غائب تھا۔

دوسری ملکی مجلسِ قانون ساز میں سیاست دان نے ایک زبردست تقریر کی' جس کا آخری فقرہ یہ تھا ''قوم کا تنزل قریب ہے' عورت کو زنجیروں میں جکڑ کر رکھو' کیونکہ عورت کی خواہشات اس کے گیسوؤں کی طرح دراز ہیں''۔

غزل

قدیرؔ شیدائی

میں نے ان سے رازداری کا صلہ چاہا نہ تھا
معتبر ٹھہروں گا محفل میں ' کبھی سوچا نہ تھا

یک بہ یک بیدار مجھ کو کر گئی بانگِ سحر
نیند کا غلبہ تھا لیکن میں ابھی سویا نہ تھا

سورۂ الحمد نے توڑا طلسمِ آزری
میں بتوں میں گھر گیا تھا ' راستہ ملتا نہ تھا

دیکھتے ہی دیکھتے سب داغِ عصیاں دھل گیے
ٹوٹ کر ابرِ کرم ایسے کبھی برسا نہ تھا

خود سری نے عجز میں ڈھل کر کیا زندہ مجھے
ہوگئی بخشش ' ابھی روزِ حساب آیا نہ تھا

دیکھ کر جس کو گماں انسان کا ہوتا قدیرؔ
کوئی چہرہ وقت کی زنبیل میں ایسا نہ تھا

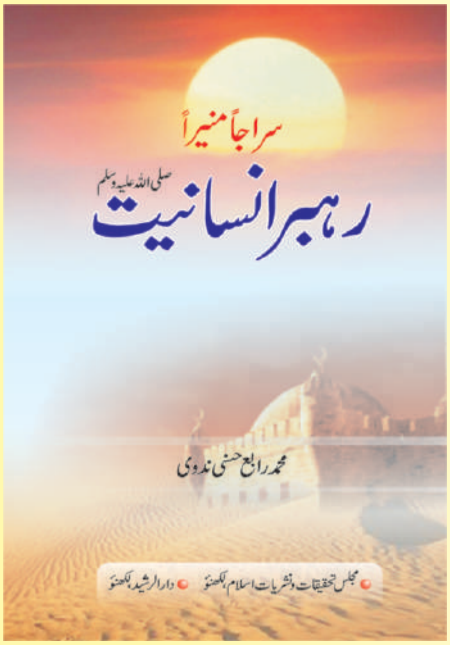

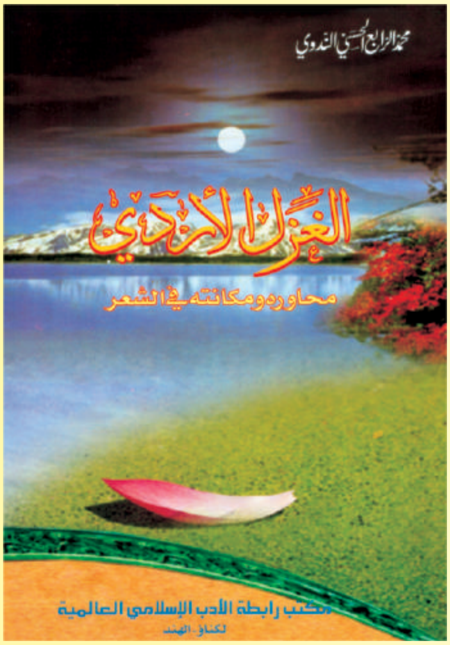

Designed by : Mashhud (Mashhud Enterprises) #9235794786, 9208375733
Printed at : Parekh Offset Printing Press #9839133588